اُردُو اور صُوفی ازم

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

مقتدرہ قومی زبان ○ اِسلام آباد

۱۹۸۶ء

پمفلٹ نمبر ۱۴

طبع اوّل : ۱۹۸۶ء

طابع : پیپ بورڈ پرنٹرز لمیٹڈ ،
راولپنڈی

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
(صدر نشین)
مقتدرہ قومی زبان
مکان نمبر ۱۰ ، گلی نمبر ۳۲ ،
سیکٹر ایف ۸/۱ ،
اسلام آباد

اُردُو اور صُوفی ازم

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

۱۹۸۶ء

عرضِ ناشر

اُردو زبان کی لسانی بنیادیں تہذیبی اور ثقافتی تاریخ میں پنہاں ہیں۔ یہ تاریخ ہمارے دینی ادب اور تصوف کی روایات میں آگے بڑھتی ہے۔ اُردو زبان و ادب کی تشکیل و ترویج میں اسلامی ادب اور متصوفانہ اصطلاحات نے اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس کتابچے میں مصنف نے خصوصی طور پر تصوف کے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

ع دل بدست آور کہ حج اکبر است

یہ مصرع تصوف کے اصل اصول کا کھرا ترجمان ہے۔ صوفیوں کے عقیدے کے مطابق انسانیت کا درجہ عقیدے سے بڑھ کر ہے۔ بقول سید علی ہجویری ؒ:

"طریقت کی تحقیق کے مطابق لفظ "صوفی" کے ہر ہر معنی میں ایک لطیفہ اور نکتہ مخفی ہے۔ مگر لغوی معنی اور ہیں۔ اصل صوفی صفا کی ستودہ صفات کا اظہار ہے۔ جب اہلِ تصوف اپنے معاملات اور اپنے اخلاق و خیالات کو مہذب بناتے اور صفائے قلب حاصل کرتے ہیں۔ طبیعتوں کی آفتوں اور دل کی مکروہ خواہشات سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور کثافت و کدورت سے اپنے باطن کو پاک و صاف کرتے ہیں تو صوفی کہلاتے ہیں۔ صوفی کی تعریف خاص خاص معاملات پر محیط و محدود نہیں ہے، اس کے معنی بڑے وسیع اور ہمہ گیر تر ہیں۔ صوفی وہی ہے جو کدورت کو ترک کر دے۔ اب کدورت کی وسعت ملاحظہ ہو: بدی، کینہ، حسد، ضرر رسانی، دروغ، فریب، حرص، نفس کی اطاعت، خدا اور رسول کے احکامات کی مخالفت، یہ تمام چیزیں کدورت میں داخل ہیں۔ پس صوفی وہی ہے جس نے اپنی ذات کو دیگر ابنائے جنس کے مفاد و فلاح اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے وقف کر رکھا ہو۔ وہ طبیعتوں کی قید اور مخلوق کی خواہشات سے آزاد ہوتا ہے اور ازلی و فطری حقیقتوں سے مکمل ربط و ضبط رکھتا ہے۔" [1]

جے ایس ٹرمنگھم لکھتے ہیں:

Those tendencies in Islam which aim at direct communion between God and Man."

اس تشریح کے بعد اس سے بحث نہیں کہ صُوفی "صُوف" سے مشتق ہے یا "صفا" سے، البتہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ تمام مذاہبِ عالم میں "صُوفی" مذہبی اور اخلاقی اعتبارات سے ایک خاص حیثیت کا حامل رہا ہے۔ علاقائی سرحدوں کی حد بندیوں سے بے نیاز، ہر زمانے میں وہ بظاہر ایک باغی ہے جو ظاہر داری کو دلوں کو مردہ کر دیتی ہے، روا نہیں رکھتا۔ اُس کی آواز معاشرے کے سخت گیر اصُولوں کے خلاف ایک باغیانہ لحن ہے، اُس کی نظر ظاہر اور باطن دونوں پر یکساں ہے۔ وہ لفظ کے مقابلے میں معنی پر زور دیتا ہے اور "شر" میں "خیر" کے پہلو ڈھونڈتا ہے۔ وہ "دُنیاداری" سے دُور رہتا ہے لیکن دُنیا کی اصل اُس کی نظر سے پوشیدہ نہیں، یُوں وہ دُنیاداروں کی نسبت کہیں زیادہ دُنیا کو سمجھتا ہے۔

تصوف کی رُو سے کسی خاص رنگ، نسل اور علاقے کو معرفتِ الٰہی کے باب میں کچھ فضیلت حاصل نہیں۔ مشرق اور مغرب، ہر دو اطراف میں نامور صُوفیا گذرے ہیں۔ دورِ جدید میں جہاں مُسلم صُوفیا میں پیر مہر علی شاہؒ (گولڑہ شریف) کا نام ملتا ہے وہیں مغربی صُوفیا میں گرجیف (GURDJIEFF) کا نام بھی قابلِ احترام ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ صُوفی (عارف) کو انسانی نفسیات کا سچا ادراک حاصل ہے اور اُسے جسموں کی بجائے دلوں کی حکمرانی عطا ہوئی ہے۔

دیگر مذاہبِ عالم کی طرح مسلمانوں میں بھی ابتدا سے ایک گروہ ایسا موجود رہا ہے کہ جس نے مقاصدِ دُنیوی سے قطع تعلق کر کے اپنا نصب العین "یادِ الٰہی" اور "سلوک" رکھا ہے۔ ان اصحاب کے بارے میں حکم ہے:

" دُور مت کرو ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں اور اُس کے طلب گار ہیں۔" (قرآن مجید)

رفتہ رفتہ اس گروہِ خاص کا نام "گروہِ صُوفیہ" پڑا اور اس زندگی کرنے کے ڈھنگ کو "مسلکِ تصوف" کہا گیا۔ جُنید بغدادی سہروردیؒ نے تصوف کی آٹھ قسمیں بیان فرمائی ہیں:

۱۔ رضا ۔ ۲۔ سخا ۔ ۳۔ صبر ۔ ۴۔ اشارہ ۔ ۵۔ غربت ۔ ۶۔ لباس ۔ ۷۔ سیاحت ۔ ۸۔ فقر

یہاں یہ وضاحت نہایت ضروری ہے کہ تصوف کبھی بھی اسلام کے مقابلے میں کسی جُداگانہ مسلک کے طور پر نہیں اُبھرا البتہ یُوں کہہ لیں کہ تصوف ابتدا سے تمام مذاہبِ عالم کی پاکیزہ ترین تعبیر رہی ہے اور اسلام میں بھی صوفیانہ رویہ، مذہبی کٹڑپن سے جُداگانہ شکل رکھتا ہے، سو یہاں صُوفی شریعت اور طریقت دونوں

پر کاربند رہنا۔

اوّل، شریعت — نماز، روزہ، حج، زکاۃ اور دیگر احکام پر پوری تن دہی سے عمل پیرا ہونا۔

دوم، شریعت کے باطن سے بخوبی واقفیت، جو صبر، رضا، توکل، سخا، احسان، شوق اور محبت پر بنیاد ہے۔ یہی طریقت ہے۔ [3]

تصوّف میں تزکیۂ باطن کو اہمیت حاصل ہے جب کہ تصوّف کی مسخ شدہ صورتیں ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور یونانی اوہام میں نظر آتی ہیں۔

مسلمانوں میں تصوّف کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں اہلِ طریقت کا اوّلین مسلک (سلسلہ) قائم ہوا۔ اسے شیخ علوانؒ نے ۱۴۹ ہجری مطابق ۷۶۶ء میں بمقام جدّہ مرتّب کیا اور اس کا نام "سلسلۂ علوانیہ" رکھا۔ تیسری صدی ہجری میں صوفیا نے لفظ "صوفی"، "تصوّف" اور "متصوّف" پر بحثیں کیں اور ان الفاظ کی تشریحات کیں۔ جب کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے عین آغاز پر معروف کرخیؒ نے قرآن مجید کے باطنی معنی دریافت کیے، جنہیں بعد ازاں باقاعدہ مدوّن کیا گیا۔ معروف کرخیؒ کا نظریہ "خوفِ خدا" سے مختلف تھا، اس کی بنیاد عشقِ خداوندی پر تھی۔ نہ جہنم کا ڈر اور نہ جنت کی خواہش۔ یہ خدا سے محبت کا آفاقی نظریہ تھا جسے سری سقطیؒ نے نظریۂ طمانیت میں ڈھال دیا۔

تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں ہمہ اوست (ہر شے میں خدا) کے نظریے نے تصوّف کے حصار پر دستک دی اور یوں صوفیانہ نظر نے ایک اہم کروٹ لی۔

لیکن باوجود اختلافات کے تمام صوفیا (عالمین) دو باتوں میں متفق الرائے تھے یعنی (۱) غیر مسلموں سے حسنِ سلوک اور (۲) اشاعتِ اسلام۔

شروع زمانے میں بکتاشی درویش حلقۂ مولویہ [4] کو بنظرِ حسد دیکھتے تھے [5] البتہ غیر مسلموں سے رواداری ہر دو گروہوں میں یکساں تھی۔ یہاں تک کہ حلقۂ مولویہ میں طریقِ رواداری مولانا رومؒ نے رائج کیا۔ [6]

گیارہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں میں فرقہ بندی درجۂ انتہا تک پہنچ گئی تھی، اہلِ قلم ان فرقوں پر مستقل کتابیں لکھتے اور فرقوں کو "مذاہب" کہتے تھے۔ تنہا شیعوں میں سولہ فرقے پیدا ہو گئے تھے جب کہ سنیوں کے فرقوں کا شمار مشکل ہو گیا تھا۔ اگر فرقوں کا شمار کرنا مقصود ہو تو عبدالقادر بغدادی (متوفی ۱۰۳۷ء) کی مشہور تصنیف "الفرق بین الفراق" اور ابنِ حزم (م ۹۹۴ء تا ۱۰۶۴ء) کی تصنیف "کتاب الملل والنحل" دیکھیں

جا سکتی ہیں۔

ایسے میں صُوفیا کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو پیشہ ور مُلّا کے شکنجے سے نکال کر کثرت میں وحدت پیدا کی۔ یہاں تک کہ ہر خیال کا مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی حلقۂ صُوفیا میں شریک ہو سکتا تھا۔ یُوں عثمانیوں کے عہد میں جملہ ترک قبیلے صُوفیوں کی بدولت مسلمان ہو گئے۔

سولہویں صدی عیسوی میں آ کر مختلف طبقات کے درمیان فرق برائے نام رہ گیا۔ مصنف "الطبقات الکبریٰ" صُوفی عبدالوہاب الشعرانی (۱۴۹۳ء تا ۱۵۶۵ء) خود ۲۶ طریقوں سے منسلک تھے۔

بیسویں صدی عیسوی تک آتے آتے تصوّف کی ہر دو بڑی راہوں یعنی "وحدت الوجود" اور "وحدت الشہود" سے بھی وہ مقبولیت چھن گئی جو کبھی انہیں حاصل تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ "بابائیت" یا خانقاہی نظام کی نامقبولیت رہی ہو۔

منکرین تصوّف کہتے ہیں کہ قرآن اور احادیثِ نبویؐ کے سارے دفتر میں کہیں تصوّف یا گروہِ صُوفیا کا ذکر نہیں آیا۔ جب کہ صُوفیا کے نزدیک (کتاب اللمع، از شیخ ابو النصر سراجؒ) قرآنِ حکیم میں ایسے الفاظ و عبارات کثرت سے آئے ہیں، جن سے مُراد اہلِ تصوّف ہی ہیں مثلاً موقنین، مخلصین، ذاکرین، محسنین، عابدین، صابرین اور راسخین وغیرہ۔ اسی طرح حدیث سے ایک مثال:

"میری اُمّت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو مکالمہ اور گفتگوئے الٰہی سے سرفراز کیے جائیں گے اور عمرؓ انہی میں سے ہیں۔"

اسلامی تصوّف پر "کتاب اللمع" از شیخ ابو النصر سراجؒ، "کشف المحجوب" از سیّد علی ہجویریؒ، "رسالہ القشیریہ" از استاد ابو القاسم قشیریؒ، "فتوح الغیب" از شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، "عوارف المعارف" از شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، "فوائد الفواد" از خواجہ نظام الدین دہلویؒ، "منطق الطیر" از شیخ فرید الدین عطارؒ، "لوائح" از شیخ عبدالرحمٰن جامیؒ، "فقرِ محمدیؐ" از شیخ احمد الواسطیؒ وغیرہ اہم تصانیف شمار ہوتی ہیں۔ ان تصانیف میں تصوّف کے معنی، تصوّف کی بنیاد، تصوّف کا اصل اصول، فقر کی علامات، مسلک کا انجام، کاملین کا مرتبہ، سماع اور قرآن کی تشریحات اور عمل ہدایات ملتی ہیں۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان صُوفیا کرام نے مسلم حملہ آوروں کے لیے سیاسی اور تہذیبی سطح پر زمین ہموار کی۔ لیکن اس ضمن میں تا حال وسیع شواہد کی ضرورت محسوس کی جاتی

ہے۔ خود میرے خیال میں صوفی اور حملہ آور کی نفسیات سراسر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ حملہ آور نفسانی خواہشات کا اسیر ہے جب کہ صوفی ترکِ دُنیا کا قائل ہے (یہ الگ بات ہے کہ دُنیا کی حقیقت اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں) سو ان کا گٹھ جوڑ ممکن نہیں۔

جن صُوفیا کرام نے اُردو زبان کی نشوونما میں بھرپور کردار ادا کیا، اُن میں سے بیشتر "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (قرآنِ مجید) یعنی اچھے کاموں کی تبلیغ اور بُرے افعال سے باز رکھنے کے جذبے کے تحت، پُرخطر اور دُشوار گزار راستوں اور لق و دق بیابانوں سے ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے تھے جہاں کی ہر چیز ان کے لیے اجنبی تھی اور زندگی کرنے کا چلن یکسر مختلف تھا۔ یہ اُن کے مسلک کی عطا تھی کہ انہوں نے اس اجنبی سرزمین کے دل پر حکومت کی، مثلاً میراں جی شمس العشاقؒ اور برہان الدین جانمؒ جو مکہ (عرب) سے ہند آئے اور یہیں عمریں گزار دیں۔

نووارد کے لیے زبان سے شناسائی ضروری ہے کہ رابطہ کی ابتدا زبان سے ہے۔ آپ اصحاب نے ہندوستان کے عام لوگوں کی بول چال کی زبان سیکھی اور اسی زبان میں تعلیم و تلقین فرمایا کیے۔ ان تمام حالات کا ذکر اکھر دتی نے تفصیل سے کیا ہے، جن سے صُوفیا کرام کو واسطہ رہا۔ یہاں یہ وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اُردو کی ابتدائی نشوونما کے سلسلے میں خصوصی طور پر علاقہ دکن اور گجرات کے عارفین کا ہی تذکرہ مقصود ہے، اس لیے کہ ہندوی (اُردو) جیسی عامی زبان کو ابتداً انہی دو علاقوں کے صُوفیا نے ادب کی مسند نشین پہ بٹھایا اور اُردو زبان و ادب کی ترویج کا باعث بنے۔

دکن اور گجرات میں مسلمان صُوفیا کرام کے چھ سلسلے بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں :

۱۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ (۱۳۰۵ء تا ۱۳۹۲ء) کا مرکز بیجاپور (دکن) تھا۔ اسے بیجاپور کے متصوفانہ سلسلے کا دورِ اوّلین کہنا چاہیے۔ شیخ عین الدینؒ نے مختلف موضوعات پر کم و بیش ۱۳۲ رسائل تصنیف و ترجمہ کیے۔

۲۔ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو درازؒ (۱۳۲۱ء تا ۱۴۲۲ء) نے بیجاپور (دکن) کو ایک بار پھر رُوحانی سلسلے کا مرکز بنایا۔ فارسی اور عربی کے علاوہ ہندوی (اُردو کی ابتدائی شکل) کو بھی رابطے کا ذریعہ بنایا۔ اُن کے بعض رسالے اُردو زبان کے تشکیلی دور کے نمائندہ ہیں۔ خصوصاً رسالہ "معراج العاشقین" موضوعِ بحث بنا، دیگر رسائل میں "سہ بارہ"، "تلاوت الوجود"، "شکار نامہ" اور "تمثیل نامہ" نمایاں ہیں۔ بعض

محققین نے "معراج العاشقین" کی زبان کے پیشِ نظر بعد کی تصنیف قرار دیا ہے۔

"معراج العاشقین" کی اوّلین طباعت ۲۹ صفحات پر مشتمل رسالہ ہے۔ جسے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن نے شائع کیا۔ "معراج العاشقین" سے دو اقتباسات دیکھتے چلیے:

۱۔ "مراقبے کی گوری مشاہدے کے کانٹے میں میکائیل کی مدد کے پانی سوں جل کا کاڑا کرکو پلانا۔ سگن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو شفا پائے گا۔ طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرے۔ تو اتنے بھی طبیب ہووے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی۔ ماٹی میں پانی۔ ماٹی میں آگ، ماٹی میں باد، ماٹی میں خالی۔ ان پانچ عناصران کا واجب الوجود ہو جا تو معرفت تمام ہوا۔"

۲۔ "نبی کہے ـــــ تحقیق خدا کے میانے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھارے کے۔ اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔"

("معراج العاشقین" سے اقتباسات)

۳۔ "سوال: ذاتی ایمان کون سا اور صفاتی ایمان کون

جواب: اگہنشا حال ثابتی ہے۔ سو ذاتی ایمان وہ ہے۔ ثابتی آتی اور جاتی ہے۔ سو صفاتی ایمان۔"

("سہ بارہ" سے اقتباس مخطوطہ کتب خانہ نواب عنایت جنگ بہادر)

[1] عبداللہ حسینیؒ اور سید شہباز حسینیؒ بندہ نوازؒ کی اولاد میں سے ہیں، جن کے رسائل اور ہندوی زبان کی غزلیں خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب رہیں۔

۳۔ شاہ میراں جی شمس العشاقؒ (متوفی ۹۰۲ھ) نے تیسری بار بیجاپور (دکن) کو روحانی سلسلے کا مرکز بنایا۔ آپ کمال الدین بیابانیؒ کے مرید تھے۔ اب تک عام خیال یہ رہا ہے کہ اگر امیر خسروؒ کی شاعری اور بندہ نواز گیسو درازؒ کے رسالہ "معراج العاشقین" سے صرفِ نظر کیا جائے تو شاہ میراںؒ اردو کے پہلے صوفی شاعر بنتے ہیں، لیکن یہ نظریہ یا خیال غلط ہے اگر شاہ میراں جیؒ کے مرشد شاہ کمال الدین بیابانیؒ کی مثنوی "چہار شہادت" کا بغور مطالعہ کیا جائے اور زبانی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس شعبہ میں شاہ کمال الدین بیابانیؒ کی اوّلیت تسلیم کرنا پڑتی ہے۔

جب "چہار شہادت" از شاہ کمال الدین بیابانیؒ اور "مغزِ مرغوب" از شاہ میراں جیؒ کو ایک جلد میں باہم ملا کے شائع کروایا[۹] تو پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے اس مسلمہ حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔ افسوس کہ ہمارے ہاں تا حال اُسی پرانی لکیر کو پیٹا جا رہا ہے۔ "مغزِ مرغوب" اور "چہار شہادت" کا تقابلی مطالعہ بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ "چہار شہادت" از شاہ کمال الدین بیابانیؒ کی زبان قدیم تر ہے۔

شاہ میراں جیؒ سے منسوب دیگر رسائل میں "شہادت الحقیقت" اور "شرح مرغوب القلوب" ہیں جب کہ "خوش نامہ" اور "خوش نغز" نامی دو گیت نما طویل نظمیں ہیں۔ "شب رس" نامی رسالہ شاہ وجیہہ الدین کی فارسی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔[۱۰]

"شرح مرغوب القلوب" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"پیغمبر کہے جے کچھ کام کرے گا کرنی خدا ناؤں نا لے کر تو او کام پائمال ہوگا۔ سرانا، نوانا خدا کو بہوت کر اوپاں ہارا ہے عالم کا۔"[۱۱]

شاہ برہان الدین جانمؒ (متوفی ۱۵۹۷ء)[۱۲]، شاہ میراں جیؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ وہ مثنوی اور دوہے کے شاعر تھے (مجموعے "جل ترنگ"، "ارشاد نامہ" اور "گل باس") اُن کا رسالہ "کلمۃ الحقائق" نثر میں ہے۔[۱۳] ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ان کے کلام میں "سادگی اور شاعرانہ لطافت" کی نشاندہی کی ہے۔

"کلمۃ الحقائق" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اللہ کرے سو ہووے کہ قادر، توانا ہووے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرن ہار۔ ہنچ ہنچ سو تیرا ٹھارہ ہنچ ہوا بھی تو ہنچ ہی باؤ ہدھان کچھ نہیں بھی تھا تھیں۔ دوجا شریک کوئی نہیں۔ ایسا حال سمجھنا خدا تھے خدا کوں، جس پر کرم خدا کا ہوئے۔

سوال: یہ تن الادھا بلکہ سنتر بکار روپ رہتا ہے یک تل قرار نہیں جیوں حرکت روپ۔

جواب: اے عارف! ظاہر تن کے فعل تے گڑیا و باطن کرتب دستے۔ اس کا قانون سو کن اوجود۔"

اسی رُوحانی سلسلے میں سید میراں حسینی شاہؒ مترجم "شرح تمہید ہمدانی"، امین الدین علی اعلیٰؒ (متوفی ۱۶۷۵ء) اور پیر بادشاہؒ کے نام نمایاں ہیں۔ محمود بحریؒ (متوفی ۱۷۱۱ء) اس رُوحانی سلسلے کے آخری نمایاں شاعر ہیں۔ آپ نے شاعری کے لیے ہندوی (اُردو) اور نثر کے لیے فارسی زبان برتی۔ "کلیات محمود بحریؒ" لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔

۴۔ شاہ صبغۃ اللہؒ نے بھی عرصہ چار سال کے لیے بیجاپور (دکن) میں قیام کیا۔

۵۔ شاہ ابوالحسنؒ بیدر سے بیجاپور (دکن) تشریف لائے۔ وہ بیجاپور (دکن) کے پانچویں روحانی سلسلے کے بانی تھے۔ ان کی مثنوی "سک انجن" مشہور ہے۔

۶۔ اشرف بیابانیؒ (۱۴۵۹ء–۱۵۲۸ء) بھی بیجاپور سے متعلق تھے آپ کی تین مثنویاں "نوسرہار"، "واحد باری"، اور "لازم المبتدی" خاصی مقبول رہی ہیں۔ البتہ یہ اختلافی مسئلہ ہے کہ امیر خسروؒ دہلوی نے آپ کی مثنوی "واحد باری" کے طرز پر "خالق باری" تصنیف کی یا نہیں۔

رچرڈ میکسویل ایٹن (RICHARD MAXWELL EATON) نے بیجاپور کے صوفیا کی دو سطحوں پر درجہ بندی کی ہے[۱۵] ملاحظہ فرمائیے:

Warrior Sufis were too occupied in military struggles to develop the speculative aspect of Sufism, and the Reformist Sufis, by championing the cause of orthodoxy within the Muslim establishment in Bijapur, too frequently divorced themselves from the free-thinking and free-living styles associated with Sufism as understood by writers like Trimingham. Both of these types should be understood as Sufis in a strictly institutional rather than a mystical sense. The Chishtis of Shahpur Hillock, by contrast, conformed to both senses of the term. Furthermore, many of them recorded their experiences and teachings in a body of prose and poetry works directed to either their own disciples or the non-Sufi public. It is this that differentiates them from all other Sufis of Bijapur and on account of which they may be termed the Literati. They are significant for (a) their role in the development of Dakhni and Urdu literature, (b) their formulation and dissemination of Sufi doctrine, and (c) their role in the diffusion of popular Islam in the Deccan."

۷۔ ساتواں رُوحانی سلسلہ دکن کی ریاست گولکنڈہ سے متعلق ہے۔ اس سلسلے کے بانی میراں جی حسن خدانما (متوفی ۱۶۵۹ء) تھے۔ آپ ہندوی (اُردو) کے ابتدائی مستند نثر نگاروں میں سے ایک ہیں۔ آپ کی نثری تحریروں میں "شرح تمہید ہمدانی یا شرح شرح تمہید" (حدود ۱۶۰۳ء) "شرح مرغوب القلوب" اور رسالہ "وجودیہ" یادگار ہیں۔

"شرح تمہید ہمدانی" کے دو مخطوطے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ یہ ایک قدیم صوفیانہ فارسی تصنیف تمہیدات عین القضات مصنفہ عبداللہ بن محمد ہمدانی (المعروف عین القضاۃ) کی شرح اور ترجمہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

"خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قاضی عین القضات کو کہے کہ تمیں کئے سو کتاب مُجے دکھلاؤ، تو کتاب دیکھکر بہوت خوش ہوئے، ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کیے۔ ہور اسے کہنا بھی میرا چھ ہے۔ اسے کیمیں ایک سطے ہیں، تمیں جوں پانا ہے یوں پائے۔ دے ہر کسی کوں اسے نکو کہو۔ جسے اس کی قدر معلوم ہوگی اُسے کہو۔ ہور بھی کوئی طلب رکھے گا تو اُسے بھی کہو۔ دے اس جنس سوں تعلیم دیو۔ جوں دودھ پیتا سو نہنواکوں ہیٹر اروٹی کھانے کے لائق کرتے ہیں یوں کرو جیوں میں کیا ہوں۔ بارخدایا جی مجکے اس حقیقت کا مانا مُجے معلوم تھا سو ہولیا کیا ہے کہ اس میں مقصود خوب ہی کر۔ تو میں تیرے یہاں پناہ منگتا ہوں، کہ اس میں خطا ہور خلل ہور سہو مُجے ہوا ہے سو اُسے بخش قاضی عین القضات کی دوستی۔"

آپ نے "بشارت الانوار" کے علاوہ دو مثنویاں یادگار چھوڑیں۔

گجرات کے صوفیائے کرام میں سے بہاء الدین باجنؒ (متوفی ۱۵۰۶ء) قاضی محمود دریائی بیرپوریؒ، شاہ علی محمد جیو گام دھنیؒ (متوفی ۱۵۶۵ء) (مجموعۂ کلام "جواہر اسرار اللہ") میاں خوب محمد چشتیؒ (مصنف "خوب ترنگ" متوفی: ۱۶۱۴ء) اور بادشاہ حسینیؒ کے نام نمایاں ہیں۔

حیدرآباد، دکن (خصوصاً بیجاپور اور گولکنڈہ) اور گجرات کے ان صوفیائے کرام نے باقاعدہ ہندوی (اُردو)

سیکھ کر اسی زبان میں رُشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا اور یوں خاطر خواہ تبلیغی اثرات نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اور تراکیب کے اثرات کے تحت ہندوی زبان میں نکھار آنے لگا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہندوی جیسی گری پڑی عامی زبان ایک خاص طرح کا رچاؤ پیدا ہونے کے بعد خواص کا ذریعۂ اظہار بھی بننے لگی ۔

صوفیا کرام نے جن ذرائع ابلاغ سے تبلیغ و ہدایت کا کام لیا وہی اُردو زبان اور ادب کے ابتدائی نمونے قرار پائے ۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ نثر :

گفتار نامے (مکالمے)، خطبات، ملفوظات اور اقوال ۔

۲۔ نظم :

دوہا، چوپائی، گیت، غزل، کافی، نظم، سی حرفی، مثنوی، قطعہ، تعقد، ریختہ، سنہارد (بارہ ماسہ) کہنی، کہہ مکرنی، پہیلی اور رباعی ۔

نثر :

"تاریخ فیروز شاہی" ۱۳ ویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے ۔ اس میں بھی کچھ مکالمے درج ہیں جو صوفیائے کرام کی روزمرہ گفتگو کا ریکارڈ ہیں ۔ یہ مستند اس اعتبار سے ہیں کہ انہیں تاریخ میں جوں کا توں نقل کر دیا گیا ۔ "تاریخ فیروز شاہی" سے یہ مثالیں گفتار نامے کی ذیل میں آتی ہیں :

۱۔ مثال کے طور پر ایک جگہ حمید الدین ناگوریؒ کے متعلق شیخ بادل نے لکھا ہے، کہ حضرت ناگوریؒ کے فرزند خاصے تنگ دست تھے ۔ ایک روز عُسرت کی شکایت کی ۔ بیٹے کی بھوک اور نقاہت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا :

"ہاں بابا کچھ کچھ"

دیگر مثالوں میں ایک فقرہ ملاحظہ کیجیے جو آتے آتے محاورے کا درجہ اختیار کر گیا ۔

۲۔ فرید گنج شکرؒ (متوفی ۱۲۶۹ء) ایک بار اپنے مرشد قطب الدین کاکیؒ کو ڈھونڈ رہے تھے ۔ آپ نے آنکھ پر پٹی باندھ رکھی تھی ۔ مرشد نے پوچھا تو فریدالدین گنج شکرؒ نے جواب میں کہا :

"آنکھ آئی ہے۔"

۳۔ اسی طرح حضرت برہان الدین جانمؒ جب بچے تھے اور اُن کے والدِ گرامی کا انتقال ہو گیا تو مادرِ مومنہ (مادرِ مومنہ) بچے کو فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں لائیں۔ آپ حضرت اُس بچے ہی کو خلافت عطا کرنا چاہتے تھے۔ مادرِ مومنہ حیران تھیں، بولیں:

"خواجہ، برہان الدین بالا ہے۔"

حضرت نے جواب میں فرمایا، "مادرِ مومنہ اُپَرنیوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔"

۴۔ حضرت قطبِ عالمؒ کے فرزند سید شاہ محمودؒ (المعروف بڈھ شاہ) کے ہاں لڑکا (شاہ راجوؒ) تولد ہوا۔ یہ خبر سن کر بندہ نواز گیسو درازؒ نے فرمایا:

"بھائی محمود خوش ہو۔ آساں تھیں وڈا، تساں تھیں وڈا ساڈے گھر جلال جہانیاں آیا۔"

اس کے علاوہ اُردوے قدیم میں فرید گنج شکرؒ اور خواجہ چراغ دہلی مرشد اخی سراج (متوفی ۱۳۵۶ء) کے دو ایک فقرے درج ہیں، یعنی فرید گنج شکرؒ کا ارشاد "پونچ سرکے" اور خواجہ چراغؒ کا فرمودہ "تم اوپر دسے تلے" ملفوظات کی ذیل میں آتے ہیں۔

خُطبات بڑی مذہبی تقاریب کے مواقع پر دیے گئے اور چونکہ عوام سے رابطے کی زبان "ہندوی" تھی اس لیے خُطبات کے لیے یہی زبان برتی گئی، البتہ کوئی خُطبہ آج دستیاب نہیں۔ جہاں تک ملفوظات کا معاملہ ہے تو قدیم ترین مجموعہ ہائے ملفوظات میں شیخ بہاءالدین ذکریا ملتانی کے ملفوظات کا مجموعہ "خلاصۃ العارفین" نمایاں ہے۔

اقوال اور ملفوظات کو نجی محفلوں میں مُریدوں اور قریبی احباب سے بات چیت کا ریکارڈ کہنا چاہیے۔ یہ گفتگو عام طور پر دینی یا عرفانی موضوعات پر ہوا کرتی تھی۔ ملفوظات اور اقوال نثر میں بھی ہیں اور نظم میں بھی۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

حضرت قطبِ عالم گجراتیؒ: "محمد برہیں کھڑیاں، سائیں پریم چھلٹے۔"

("اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" — از ڈاکٹر عبدالحق)

اسی طرح صوفیائے کرام کے اقوال سینہ بہ سینہ چلتے ہم تک پہنچتے ہیں۔ ملفوظات کی طرح اقوال بھی رہبری کے لیے ہی تھے، ایک آدھ جملہ لیکن ہزاروں باتوں پر بھاری۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا قول ہے :

"جیکی سچ خدا کو نہ ملے" (اردو کی ابتدائی خدمات میں صوفیا کرام کا کام" ، از : ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

اردو زبان کی نشوونما کے ضمن میں صوفیا کرام کے رسائل و کتب بڑی دلچسپ صورتِ حال سامنے لاتے ہیں۔ اس ضمن میں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کا "مجموعۂ گنج شکر"، خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے منسوب رسالہ "معراج العاشقین"[15]، میراں جی شمس العشاقؒ کا "شرح مرغوب القلوب"[16] اور شاہ برہان الدین جانمؒ کا رسالہ "کلمۃ الحقائق"[17]، خصوصی طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ چند اقتباسات دیکھیے :

١۔ "قال النبی علیہ السلام ہے، انسان کے بوجھنے کوں پانچ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ۔" ("معراج العاشقین" از بندہ نواز گیسو درازؒ)

٢۔ "پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہے، جے کوئی کام کرے گا، کوئی خدا کا ناؤں نالے کر، تو او کام پائمال ہووے گا ۔" ("شرح مرغوب القلوب" از میراں جی شمس العشاقؒ)

٣۔ "اللہ کرے سو ہووے کہ قادر، توانا سوے کہ تیرا القدیم اس قدیم کا بھی کرن ہار۔ ہنج ہنج سو تیرا تھا وہ ہنج ہوا بھی تو ہنج بھی باوجود عیان کچھ نہیں بھی تھا تیں۔ دوجا شریک کوئی نہیں ۔" ("کلمۃ الحقائق"، از شاہ برہان الدین جانمؒ)

اب تک صوفیا کرام کے جن نثری رسائل کا حوالہ دیا گیا ہے ان کی تاریخی اور لسانی مطالعے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں البتہ اس تناظر میں ملا وجہی کی "سب رس" (١٦٣٥ء) ایک ایسی نثری تصنیف ہے جسے ایک باقاعدہ ادیب نے ادبی اسلوب میں رقم کیا ہے[19]۔

"سب رس" تین بار انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی۔ جرمن محقق ڈاکٹر روڈالف دورباک نے ١٨٨٩ء میں اس کتاب کو مفصل مقدمے کے ساتھ اصل فارسی متن مع ترجمہ (جرمن) شائع کیا۔ ترکی میں آہی، لامعی اور صدقی جیسے معروف شعرا نے اس قصہ پر طبع آزمائی کی۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں اوّل اوّل حضرت وجیہ الدین گواتیؒ (متوفی ١٥٨٩ء) نے اس قصے پر مبنی ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری نے "حسن و دل" کے نام سے اسی قصے کو فارسی مثنوی میں بنیاد بنایا بعدہ نثر میں لکھا جب کہ داؤد ایلچی نے فارسی، شاہ بحرالعرفان اور شاہ پیر اللہ مجرتیؒ نے دکھنی (اردو) میں منظوم کیا۔[20] جب کہ خواجہ محمد سیٹل[21] نے اسی قصے کو پُر تکلف نثر میں لکھا۔[22]

حسن اور دل کی اس تمثیل کی بنیاد اس حدیث پر ہے کہ:
"مجاز حقیقت کی سیڑھی ہے" اس لیے ملا وجہی نے مجاز اور حقیقت کے رابطے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ مجازی ہجر و وصال کا ذکر کرتے وقت انہوں نے خیال رکھا ہے کہ قاری کے ذہن سے حقیقی عشق کی کیفیات محو نہ ہونے پائیں۔ اسے صوفیانہ تمثیل کہنا چاہیے۔ سو خشک فلسفیانہ مباحث کے ساتھ زندگی سے بھرپور منظر نامہ، انسانی جوان جذبوں اور دھڑکتے ہوئے مکالموں کی وجہ سے سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ملا وجہی اپنے اسلوبِ تحریر کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

"جیوں حافظ بولیا ہے، دل کے گھر کے دروازے کھولیا ہے۔"

چلتے چلاتے طرزِ تحریر کا نمونہ بھی دیکھتے چلیے:

۱۔ "مرد وو جو اپنے وقت کرے کل وقت، ابوالوقت اچھے نہ ابن الوقت۔"

۲۔ "عشق خدا کوں جیدیا تو اس کی خاطر آسمان زمین ہویدا کیا عشق خدا کوں جیدیا تو اپنا حبیب کر محمد کوں پیدا کیا۔"

("سب رس" سے اقتباس)

شاعری

صوفیائے کرام کی منظوم تخلیقی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ہندوی / دکھنی (اردو) نظم کے ذیل میں دیے گئے زمرے ملاحظہ ہوں:

۱۔ ہندی اصناف

عروضی: دوہا، چوپائی، جھولنا

موسمی: رتو سنہار (بارہ ماسہ یا بارہ ماہ)

مذہبی: شبد، اشلوک، ساکھی

غنائی: گیت (متعدد اقسام)

۲۔ فارسی اصناف

عروضی: غزل، مثنوی، قطعہ

۳۔ پنجابی / سرائیکی اصناف

وزن غنائی (یا وزن سیلابی)، کافی، سی حرفی

۴۔ قدیم اردو بالخصوص ہندوی / دکھنی کی اصناف

سماجی نظمیں، شہادت نامہ، سلام، مرثیہ، چکی نامہ، ڈھولن نامہ، تمثیل نامہ، شکار نامہ، سہاگن نامہ، چرخہ نامہ، فال نامہ، لوری نامہ، ناری نامہ، شادی نامہ، لگن نامہ۔

عارفانہ کلام، جکری (ذکری)، حقیقت، سیپارہ، سی حرفی۔

مذہبی و دیگر نظمیں، معراج نامہ، نور نامہ، شاہنامہ، میلاد نامہ، شمائل نامہ، پہیلی، مکرنی (یا کہہ مکرنی)، قصہ۔

محولہ بالا ذمرے میں کئی دیگر اصناف کا اضافہ ممکن ہے لیکن ہمارے موضوع سے متعلق صرف یہی اصناف ہیں جن میں صوفیا کرام نے طبع آزمائی کی۔ صوفیا کرام کی یہ بہت بڑی عطا ہے کہ ان کی شعری کاوشوں کے سبب آگے چل کر اردو نظم کی دیگر کئی اصناف کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے آئیے ترتیب وار محولہ بالا شعری اصناف کا صوفیا کے ہاں سرسری جائزہ لیتے چلیں۔

دوہا

یہ عروضی صنف ہے جو ایک شعر کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے ہر مصرع میں ۲۴ ماترائیں ہوتی ہیں۔ مصرع کے پہلے جزو میں ۱۳ ماترا، اس کے بعد وقفہ اور دوسرے جزو میں گیارہ ماترا ہے[۲۲]

اردو زبان کے لحاظ سے اس کا مثالی وزن یہ ہے:۔ فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فاع

ہندوستان میں دوہا کی صنف عام طور پر بھگت شاعروں کے لئے مخصوص تھی لیکن اب بھگت کبیر[۲۳] اور تلسی داس کے دوہوں کے ساتھ برہان الدین جانمؒ، امیر خسروؒ، فرید گنج شکرؒ اور شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کے دوہے بھی زبان زد خاص و عام ہوئے۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کی دوہا نگاری کا ذکر فرہنگ آصفیہ میں کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اول اول حضرت بوعلی قلندرؒ کی زبان مبارک سے مبارز خان کے ارادہ سفر کے موقع پر یہ موزوں الفاظ ادا ہوئے، جو دراصل دوہا کی فارم میں تھے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے (دوہا، بوعلی قلندرؒ)

گوری سوئے سیج پہ مُکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرؔو گھر اپنے رین بھئی چوں دیس (دوہا: حضرت امیر خسرؒو)

برہان الدین جانمؒ کے شعری مجموعوں "جل ترنگ"، "ارشاد نامہ"، "اُدرنگی پاس" میں دوہے کثرت سے ملتے ہیں۔

چوپائی (یا چوپئی)

یہ ہندی کی ایک بحر ہے، جس میں ۱۶ ماترائیں ہوتی ہیں یوں اس کا وزن ہوا:

فعلن فعلن فعلن فعلن

اس سے قدرے کم وزن، جس میں ۱۵ ماترائیں ہوتی ہیں "چوپئی" کہلاتی ہے، جس کا وزن یہ ہے:

فعلن فعلن فعلن فاع

ایک خیال یہ بھی ہے کہ چوپائی درحقیقت دوہے کی ترقی یافتہ شکل ہے یعنی جب دوہے نے دو مصرعی حد سے گزر کر چار مصرعوں کی صورت اختیار کی تو "چوپائی" اور "چوپئی" وجود میں آئی۔ گارساں دتاسی نے اسے پانچ مصرعوں کی بھی بتایا ہے۔

صوفیا میں قاضی محمود دریائیؒ کا نام اس صنف میں اولیت کا حامل ہے۔ اسے ہندی کی مثنوی خیال کرنا چاہیئے جائسی کی "پدماوت" اور تلسی داس کی "رامائن" چوپائی کی بحر میں تخلیق ہوئیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق چوپائی کی بحر میں لکھی گئی مثنویوں میں اکثر سات، آٹھ یا نو اشعار کے بعد ٹیپ کے طور پر ایک دوہا آتا ہے، جس سے بند کی تقسیم ممکن ہوتی ہے۔

جھولنا

اردو میں جھولنے کے ہر مصرع میں ۳۷ ماترائیں ہوتی ہیں۔ یہ دو اشعار پر مشتمل چیز ہے جس کا انداز مثنوی سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی دونوں اشعار میں قافیہ بدل جاتا ہے پہلے تین مصرعوں میں دس دس ماترائیں اور چوتھے مصرعے میں سات ماترائیں ہوتی ہیں شیخ فرید گنج شکرؒ، خوب محمد چشتیؒ اور قاضی محمود دریائیؒ کے صوفیانہ افکار سے متعلق جھولنے بہت نمایاں ہیں۔ فرید گنج شکرؒ نے "ذکر جلی" کو عام کرنے کی خاطر

جھونا تخلیق کیا تھا۔ "جھونا گنج شکرؒ" کی طرح خوب محمد چشتیؒ کا "خوب ترنگ" اپنے زمانے کے مقبول عزیزنہ جھولنے ہیں۔ درحقیقت یہ صنف جھولے میں سوتے ہوئے بچے کے لیے لوری کا درجہ رکھتی ہے۔

رتو سنہار (بارہ ماسہ یا بارہ ماہ)

یہ خالصتاً ہندی کی صنف ہے جو ہندوی، دکنی، پنجابی اور سرائیکی میں صوفیا کے طفیل عام ہوئی پنجابی لوک شاعروں اور صوفیا نے بارہ مہینوں کا احوال رقم کرنے کے لیے یہ صنف برتی۔ اس صنف میں ہر مہینے کی موسمی کیفیات اور تہواروں کے پس منظر میں دلی کیفیات کو بیان کیا جاتا ہے۔ ۱۶ ویں صدی کے انگریزی شاعر سپنسر نے "شیپرڈ کیلنڈر" میں بھی یہی تکنیک برتی ہے۔ شاعر رتو سنہار لکھتے وقت ایک ایسی برہن کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے جس کا پیا پردیس میں ہے۔ ان کیفیتوں میں جدائی کا عنصر نمایاں رہتا ہے، نیز قدرتی مناظر پر بدلتے موسموں اور ڈھلتے ہوئے وقت کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہوئے، حافظ محمود شیرانی نے اس صنف کو محبوب سے جدا عورت کا نالہ کہا ہے۔

بیان ہندی بکرم سمبت کے مہینوں کے حوالے سے ہوتا ہے اور چونکہ بکرم سمبت میں ہر چوتھے برس لوند کا مہینہ ملا کر ۱۲ مہینے بن جاتے ہیں اس لیے اکثر رتو سنہار (بارہ ماہ) ۱۳ مہینوں کا احوال بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکرم قطبی رہتکی کے رتو سنہار کا نام ہی "تیرہ ماسہ" ہے۔

مسعود سعد لاہوریؒ کا رتو سنہار (باراں ماسہ) قدیم اُردو میں اولین کاوش ہے۔ افضل جھنجھانوی کی "بکٹ کہانی" اور محمد بوٹا کا "پنج گنج" مشہور رتو سنہار ہیں۔ صوفیا کے اثر کے تحت ہندو شاعر ملکھی نے "باراں ماہ پانی" لکھا۔ رنگ ملاحظہ ہو:

تیر مار کے آکھیا ظالماں نے
اُسدے منہ وچ موت دا پایا پانی
ملکھی گود وچ لال شہید ہویا
حکم رب دا سی نہ دکھ پانی
پانی پانی کہندے بکھاں کوچ کر گئے
طرح طرح دے رنگ وکھائے پانی

شاہ ابوالحسنؒ کی مثنوی "سنگ انجن" پر "رتو سنہار" کا خاصا اثر ہے۔

شبد

اس لفظ میں "ب" ساکن ہے اور اس کے لغوی معنی "لفظ" کے ہیں۔ یہ گیت کی ایک ایسی قسم ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ تصوف، یوگ اور عشقِ حقیقی کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ شبد بنیادی طور پر گنگنانے کی چیز ہے اس لیے ان کی گائیکی کے راگ کی نشاندہی بھی کر دی جاتی ہے۔ حضرت فرید شکر گنجؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور شیخ بہاء الدین برناویؒ کے شبد خاصے کی چیز ہیں۔ ترکِ دنیا اور عشقِ حقیقی کے مضامین شبدوں کے ذریعے دل میں گھر کر جاتے ہیں۔ کچھ یہی سبب ہے مسلمان صوفیا کے شبدوں کی بہت بڑی تعداد "گرنتھ صاحب" میں انتخاب کی گئی ہے۔

اشلوک

یہ لفظ مذہبی گرنتھوں سے مخصوص ہے۔ "اشلوک" سنسکرت مذہبی صحیفوں میں شامل اشعار کو کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کے تلفظ کی ادائیگی میں ش ساکن اور ل مضموم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہندی میں یہی لفظ اپنے انہی معنوں کے ساتھ (س مفتوح) "سلوک" بن گیا۔ "گرنتھ صاحب" کی طرح بیشتر سنسکرت مذہبی کتب میں موضوع سے مطابقت رکھنے والے اشعار کو چُنا گیا تو ان پاکیزہ اشعار کو اشلوک کہا گیا۔ "گرنتھ صاحب" میں فرید گنج شکرؒ کے منتخب اشعار اشلوک کہلاتے ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی تصنیف "مرشد نامہ" میں بھی متعدد اشلوک شامل کیے گئے ہیں۔

ساکھی

ہندی اور ہندی کے اثر میں "ساکھی" ایک مصرعی قسم کی چیز ہے، جو دوہے کی بحر میں لکھی جاتی ہے۔ ساکھی کا موضوع پند و نصائح و اخلاقیات کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بھگت کبیر کی ساکھیاں بہت مشہور ہیں جب کہ اردو کی ایک ساکھی مختلف زمانوں میں مختلف صوفی بزرگوں سے منسوب ہوتی چلی آئی ہے۔

ع راول دے دل کبھی نہ جانا

ڈاکٹر گیان چند جین نے اس ساکھی کو حضرت سید محمد جونپوریؒ سے منسوب کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ امیر خسروؒ کے الحاقی کلام میں بہت سی ساکھیاں ملتی ہیں۔

گیت

اس کی ہیئت، مصرعوں کا نظام، قوافی اور مصرعوں کا طول مقرر نہیں۔ بلکہ چھوٹی مختصر غنائی نظم ہے جو ہندی سے اُردو میں آئی۔ اس میں ایک ٹیک کا التزام ہوتا ہے جسے بار بار تاثر کو دوبالا کرنے کے لیے دُہرایا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پہلا مصرع کا کلاً یا جزواً دُہراتے ہیں۔ اکثر آخری دو مصرعوں میں شاعروں نے اپنا تخلص بھی برتا ہے۔ ہندی شاعروں سورداس اور میرا بائی نے اس میں شہرت پائی۔ یوں بہت سے گیت بھگت کبیر سے منسوب ہیں۔ گیت تخلیق کرنے میں تقریباً تمام صوفی شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کی "خوش نامہ" اور "خوش نغز" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

عام طور پر صوفی شعرا کے تخلیق کردہ گیتوں کو مندرجہ ذیل بنیادوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ گروہ بندی یوں ہوگی [۱۸]

۱۔ پیشہ وروں کے گیت، جیسے جولاہے، کسان، مچھیرے، ملاح، دھوبی اور چرواہے کے گیت

۲۔ مذہبی گیت، زمزمے، حمد اور نعتیہ کلام

۳۔ معرفت کے گیت مثلاً سہیلا، حقیقت، چکری وغیرہ

۴۔ زندگی کی بے ثباتی سے متعلق فلسفیانہ اور اخلاقی گیت

۵۔ مختلف تقریبات سے متعلق گیت جیسے ولادت، شادی وغیرہ

۶۔ لوک گیت جن میں خصوصیت کے ساتھ بیرہ کے گیت اہم ہیں

۷۔ مذہبی تہواروں سے متعلق گیت

۸۔ موسموں اور مناظر فطرت کے حوالے سے لکھے گئے گیت

۹۔ لوریاں

دکن گجرات، پنجاب اور سندھ کے صوفی شعرا خصوصاً شاہ برہان الدین جانمؒ اور شیخ بہاءالدین باجنؒ

نے "خیال" تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ دھرپد سے الگ گائیکی یعنی "خیال" کے موسیقارانہ انگ بھی درج کر دیے ہیں۔ اسی طرح شیخ بہاء الدین باجن[۲۵]، محمود دریائی[۲۶] اور علی محمد جیو گام دھنی[۲۷] نے ہر گیت کے ساتھ راگ رنگی کا تعین بھی کر دیا ہے۔

صوفیا کو ہندوستان میں گیت کی صنف کے لیے فضا ساز گار ملی غرض یہ کہ ہندی گیت نے فراہم کیا اور یوں ہندوستانی گیت کی صنف صوفیانہ افکار کو بھی اپنے اندر سمیٹنے میں کامیاب ہو گئی۔

غزل

اس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے، جسے مطلع کہتے ہیں۔ بعد کے اشعار میں عموماً مصرع ثانی میں قافیہ برتا جاتا ہے۔ آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ غزل کی ردیف، قافیہ اور وزن کو ملا کر زمین کہتے ہیں صاحب "بحر الفصاحت" کے مطابق:

"زمینِ غزل مراد ردیف و قافیہ سے ہے مع قید بحر کے"[۲۸]

اصلاً غزل کے موضوعات مقرر تھے جیسے حسن و عشق، خمریات اور واردات قلبی کے بیان وغیرہ۔ صوفیا کرام نے عشقِ الٰہی کے حوالے سے وارداتِ قلبی کا بیان کیا یوں معرفت کا موضوع اردو غزل کو ملا۔

"صنفِ غزل کے باب میں دو ابتدائی نام شیخ فرید الدین گنج شکر[۲۹] اور حضرت امیر خسرو[۳۰] کے ہیں۔ فرید الدین گنج شکرؒ کی غزل کا مطلع ہے:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے

امیر خسروؒ کی دست بُردِ زمانہ سے بچ جانے والی صرف ایک غزل ہے جب کہ یہ واحد غزل بھی قدیم تذکروں میں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء میں یہ غزل ادبی دنیا سے متعارف کروائی۔ اس غزل کا مکمل متن ان کے تحقیقی مقالے:

" has sady shyrazi written rekhta verses? " میں شامل

تھا، یہ مقالہ " Journal of asiatic society bengal" میں سال

۱۸۵۲ء میں شائع ہوا۔

غزل کا مطلع ہے :

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

حضرت امیر خسروؒ کا مستند ہندوی (اردو) دیوان ناپید ہے۔ یوں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اشعار اُن کے نام سے منسوب ہیں جو محققین کی تحقیق کے مطابق بعد کے شعرا کی اختراعات ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ امیر خسروؒ کی ننانوے تصنیفات فارسی میں ہیں اور ہندی اشعار اور پہیلیاں اس کے علاوہ ہیں۔ "ہشت بہشت"، "سکندر نامہ"، "پنج گنج"، "لیلےٰ مجنوں"، "شیریں فرہاد"، "اعجاز خسروی"، "آئینہ سکندری"، "غرۃ الکمال"، "تحفۃ الصغیر"، اور "قران السعدین"، امیر خسروؒ سے منسوب ہیں۔

اس صورتِ حال کے بارے میں بھارت کے محقق اور شاعر ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں :

"اُن کی مادری زبان ہندوی کے تین چار لاکھ اشعار میں سے بشمول "خالق باری" ان کے چار پانچ سو شعر ہمارے پاس باقی رہ گئے ہیں۔ پھر ان باقیات کی بھی اگر محققانہ جانچ کی جائے (جو بہت مشکل ہے) تو یہ تعداد دو سو تک بھی بمشکل جا سکے گی۔"

(امیر خسروؒ بحیثیت ہندی شاعر" سے اقتباس)

عبداللہ حسینیؒ اور سید شہباز حسینیؒ (جو بندہ نواز گیسو درازؒ کی اولاد میں سے ہیں) کے نام صوفیانہ غزل میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے جب کہ خواجہ میر درد کا نام اس ضمن میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

مثنوی

لفظ مثنوی میں "م" مفتوح اور "ث" ساکن ہے۔ اس صنف میں ہر بیت کے دونوں مصرعے باہم متفق ہوتے ہیں اور ہر شعر کے بعد قافیہ بدل جاتا ہے۔ یوں اس میں طویل نظم لکھنا ممکن ہے۔ اکثر شعرا نے طوالت کی یکسانیت کو توڑنے کے لئے اپنی مثنویوں میں غزلیں، طویل ترجیع بند، قصہ، پہیلی، دوہے اور قطعات بھی شامل کر دیے ہیں۔ محمد حسین آزاد اور محمد اقبال نے اپنی مثنویوں کو بندوں میں تقسیم کر کے لکھا ہے[۴] شاہ ابوالحسنؒ کی مثنوی "سک انجمن" میں قصہ اور پہیلیاں ملتی ہیں۔

فارسی میں مثنوی کے لئے سات بحریں مخصوص تھیں۔ اردو میں صوفیا نے چند اوزان کا اضافہ کیا

اور آخر میں آتے آتے کسی بھی وزن میں مثنوی لکھی جانے لگی۔
صوفی شعراء نے مثنوی کی صنف کو التزام کے ساتھ برتا۔ اشرف بیابانیؒ کی "نوسرہار"، "واحد باری" اور "لازم المبتدی"، شاہ ابوالحسنؒ کی "سُکھ انجن" کے علاوہ میراں جی خدانماؒ کی دو مثنویاں اور شاہ برہان الدین جانمؒ کے شعری مجموعوں "جل ترنگ"، "ارشاد نامہ" اور "گل باس" میں شامل کئی مختصر مثنویاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ کہانی کے عناصر کی شمولیت کے ساتھ رشد و ہدایت کا کام زیادہ مقبول رہا ہے۔ امیر خسروؒ کی "خالق باری" کی بے پناہ مقبولیت اس کا ایک اور ثبوت ہے۔

قطعہ

صحیح تلفظ قِطْعہ (یعنی ق مکسور اور ط ساکن) ہے۔ جبکہ عربی میں قاف بالفتح بھی درست ہے۔ عربی میں قصیدے سے پہلے کی منزل قطعہ تھی۔ اس میں پہلے مصرعوں میں مطلع نہیں ہوتا۔ تمام اشعار کے مصرعِ ثانی مقفیٰ ہوتے ہیں اور جملہ اشعار معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ صوفیا کے ہاں قطعہ بہت کم دیکھنے کو ملا ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارہ
کچھ گھڑیئے کچھ سنواریئے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ سنوارا
(امیر خسروؒ)

کافی

یہ صنف پنجابی، سندھی اور سرائیکی میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ صوفیا میں بُلھے شاہؒ، خواجہ غلام فریدؒ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ نے اس صنف کو برتا۔ اُردو کی ابتدائی حالتوں میں پنجابی سندھی اور سرائیکی کا عمل دخل ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس صنف کو پنجابی اصناف کے وزن عروضی میں رکھا ہے جب کہ پنجابی/سرائیکی اور قدیم اُردو کی کافیوں میں وزن ہیلابی رکھا گیا ہے، وزن عروضی نہیں۔

سماجی نظمیں

اس ذیل میں شہادت نامہ، سلام، مرثیہ، چکی نامہ، چرخہ نامہ، پنکھا نامہ، سہیلا، سہاگن نامہ، ناری نامہ شادی نامہ، ڈھول نامہ، لگن نامہ، لوری نامہ، فال نامہ اور شکار نامہ جیسی مختصر نظمیں آتی ہیں۔

ان نظموں کا موضوع ان کے ناموں سے ظاہر ہے۔ ان تمام نظموں کا تعلق اس دور کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ یہاں تک کہ تکنیکی سطح پر بھی سماجی زندگی نے اثرات مرتب کیے۔ "سک انجن" میں دکن کے طفلانہ کھیل "آنکھ مچولی" (آنکھ چولی) کا طریقہ کار برتا گیا ہے۔ اس نوع کی نظم نگاری میں بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور میراں جی خدا نماؒ کے نام سب سے پہلے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" نامی کتابچے میں فرید الدین گنج شکرؒ کی بعض نظموں کا حوالہ دیا ہے۔ آپ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

> عشق کا دموز نیارا ہے
>
> تجز مرد پیر کے نہ چارا ہے

میراں جی خدا نماؒ کی نظم "بشارت الانوار" اس ذیل میں یادگار ہے۔ عام طور پر امیر خسروؒ کا نام بھی مختصر نظم نگاری کی ذیل میں لیا جاتا ہے، لیکن آج جن چار پانچ سو اشعار کو امیر خسروؒ کے اشعار تسلیم کیا جاتا ہے ان میں کوئی باقاعدہ نظم نہیں ملتی۔

شہادت نامہ، سلام، مرثیہ

شہادت نامہ، نثر اور نظم دونوں میں ملتا ہے۔ اردو میں "کربل کتھا" اور فارسی میں "روضۃ الشہدا" نثری شہادت نامے ہیں۔ اس صنف میں شہادت امام حسینؑ سے متعلق ایک سے زائد روایتیں بیان کی جاتی ہیں منظر نگاری اور رزمیہ پہلو پر توجہ نہیں دی جاتی جب کہ مرثیہ میں کسی ایک روایت کو بنیاد بنا کر کرب و بلا کے میدان میں ہونے والے عظیم سانحہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ "روضۃ الشہدا" کی مثنویاں اردو میں قابل ذکر شہادت نامے ہیں۔

سلام، غزل کی ہیئت میں لکھا جاتا ہے۔ صوفیا کے ہاں بھی سلام کی یہی ہیئت ملتی ہے۔ ڈاکٹر جراغ علی کے مطابق سلام شمالی علاقوں میں بالعموم مسدس کی شکل میں لکھا گیا۔ سلام کی ردیف میں السلام، سلام علیک، صلوٰت یا مرحبا شامل ہوتے ہیں۔

کنہیا لال ماتھر کے مطابق[20] سلام کا دوسرا نام "مجرا" تھا۔ "بحر الفصاحت" میں درج ہے کہ بموجب سلام مجرئی یا سلامی کے لفظ سے شروع ہوتا تھا۔ سلام سے متعلق مشاعرہ مسالمہ کہلاتا ہے۔

مرثیہ عربی میں مدح کی قسم ہے۔ رثی یا رثا کے معنی مرنے والے کی موت پر آہ و زاری کرنا ہے۔ مرثیہ میں مرحوم کی شخصی صفات کو بیان کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کی دو قسمیں ہیں (۱) شخصی مرثیہ اور (۲) کربلائی مرثیہ (یا مرثیہ امام حسینؑ)

دکن میں صوفیا نے اس صنف کے لیے غزل کی ہیئت پسند فرمائی بعد ازاں مربع میں لکھا گیا۔ اشرف بیابانیؒ نے مثنوی کے انداز میں کربلائی مرثیہ "نوسرہار" لکھا، جو اُردو کے اوّلین مرثیوں میں سے ایک ہے۔

چکی نامہ، چرخہ نامہ، پنکھا نامہ

دکھنی (ہندوی / اُردو) چکی نامہ کی صنف کو حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ نے رواج دیا۔ رنگ ملاحظہ ہو:

دیکھو واجب تن کی چکی
پیو جا تو ا ہو کے سکی
سو کن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی
کہہ یا بسم اللہ، اللہ ہو

بیجاپور (دکن) سے ۱۲ قلمی مخطوطے دریافت ہوئے ہیں، جن میں سے زیادہ تر "چکی نامہ" ہیں۔ ان مخطوطوں کی زبان انہیں ۱۷ ویں صدی عیسوی کا ثابت کرتی ہے۔ ان مخطوطوں میں سے ایک "چکی نامہ" امین الدین علی اعلیٰؒ (متوفی ۱۶۷۵ء) سے منسوب کیا جاتا ہے[21]۔ یہ بزرگ برہان الدین جانمؒ کے فرزند اور سجادہ نشین تھے[22]۔ دوسرا "چکی نامہ" امین الدین علی اعلیٰؒ کے خلیفہ شاہ خدا وند داریؒ (متوفی ۱۷۰۴ء) سے منسوب ہے۔ تیسرا "چکی نامہ" امین الدین علی اعلیٰؒ کے ایک مرید خاص فاروقیؒ سے منسوب ہے[23]۔ دیگر دو "چکی نامے" بعد کی دریافت ہیں، جن میں سے ایک قادریؒ[25] اور دوسرا شاہ کمال یا شاہ کمال الدینؒ[24] (متوفی ۱۸۰۹ء) کے نام سے منسوب ہیں۔

چکی نامہ کا ایک قلمی نسخہ "سالارؒ" نامی ایک صوفی بزرگ کا دریافت ہوا ہے، جس کے زمانے کا تاحال تعین

ممکن نہیں ہو سکتا۔ جب کہ دو چکی نامے محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز (متوفی ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۲ء) سے منسوب ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنے مضمون "خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اردو شاعری" (مطبوعہ، اکتوبر ۱۹۴۲ء) میں دو وجوہات کی بنا پر ان چکی ناموں کے محمد حسینی بندہ نواز کی شعری تخلیقات ہونے پر شک کا اظہار کیا۔ ایک تو یہ کہ محمد حسینی بندہ نواز ہندوی (اردو) میں چکی نامہ کی صنف کے آغاز سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل وفات پا چکے تھے، دوم یہ کہ قلمی مخطوطے پر کسی نسخے میں "بندہ نواز" درج ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق محمد حسینی خود کو "بندہ نواز" کہلانے سے رہے۔

چکی نامہ اور چرخہ نامہ کی اصناف میں تین باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۔ چکی نامہ میں گھومتا ہوا پتھر اور چرخہ نامہ میں چکر کھاتا ہوا کاٹھ کا دائرہ۔

۲۔ خدا، خدا کے رسول، مرشد اور بندی (مشقت کرتی ہوئی عورت) کا روحانی رابطہ۔

۳۔ چکی نامہ یا چرخہ نامہ گنگناتے وقت وارفتگی میں "ذکر" کی کیفیت۔

"کلمۃ الحقیہ" کے صفحہ ۵۳ پر برہان الدین جانم رقم طراز ہیں کہ چکی کے پھیرنے میں کسی اور طاقت کی ضرورت پڑتی ہے، کسی غیبی ہاتھ کی طاقت جو بھاری پتھر کے پھیر کو آسان بنا دے۔

برہان الدین جانم کی یہ بات چرخہ نامہ اور چکی نامہ سے متعلق بھی کم و بیش یہی معنی رکھتی ہے۔ مولوی محمد ابراہیم خوش دل (متوفی: ۱۲۰۲ھ مطابق ۸۸-۱۷۸۷ء) کے ایک چرخہ نامہ سے اقتباس ملاحظہ ہو:

اے رنگیں دیوانہ ہو عالم سوں بیگانہ ہو
دل جس پہ پروانہ ہو وہ بیکل بے شبہ دنو
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

(بحوالہ، پنجاب میں اردو، از۔ حافظ محمود شیرانی)

سہیلا، سہاگن نامہ، ناری نامہ

یہ تینوں اصناف ایک دوسرے سے خاصی قریب ہیں۔ یہ گیتوں کی تین قسمیں ہیں۔ جن میں بیاہتا عورت

اپنے شب و روز کا بیان کرتی ہے۔ سہیلا سے متعلق ڈاکٹر حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ یہ شادی اور خوشی کا گیت ہے۔[39]

ڈاکٹر حسینی شاہد کے مطابق گو سہیلے کی کوئی بحر اور ہیئت متعین نہیں لیکن اکثر سہیلوں میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ملے ہیں۔ سہیلے کا ہر بند عموماً تین مصرعوں یا کبھی کبھار چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ ہر بند کے تمام مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق بندوں کی تعداد مقرر نہیں لیکن عموماً پانچ بندوں سے زیادہ نہیں لکھے گئے۔

سہیلوں کی نسبت سہاگن نامے اور ناری نامے خاصے طویل ملتے ہیں۔ ان تینوں اصناف کی زبان اکثر ہندی آمیز ہے۔

سہیلا کے نمونے خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، میراں جی شمس العشاقؒ، شاہ برہان الدین جانمؒ اور امین الدین علی اعلیٰؒ کے ہاں کثرت سے دستیاب ہیں۔

سہاگن نامہ کا ایک مخطوطہ شاہ راجوؒ (متوفی ۱۰۸۱ھ یا ۱۶۷۰ء) کا دستیاب ہوا ہے۔[40] اسی طرح حال ہی میں سہیلا کے دو قلمی نسخے (۱۸ویں صدی عیسوی) شاہ امین الدین علی اعلیٰؒ کے پوتے شاہ علی پیر حسینیؒ کے دستیاب ہوئے ہیں۔[41]

شادی نامہ، ڈھولک نامہ، لگن نامہ، لوری نامہ

ان پانچ اصناف کا وزن بھی لوک گیتوں کی طرح مخصوص نہیں۔ یہ تمام اصناف بھی عورت کی بدلتی ہوئی سماجی حیثیت کی عکاس ہیں۔

فال نامہ، شکار نامہ

ان دونوں اصناف کا موضوع بھی ان کے نام سے ظاہر ہے۔ قدیم ترین فال نامہ شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (متوفی ۱۳۷۰ء) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی عیسوی کے کئی قلمی منظوم فال نامے حیدرآباد دکن کی سالار جنگ میوزیم لائبریری اور ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں محفوظ ہیں۔

عارفانہ کلام

ڈاکٹر گیان چند جین نے دکن کی بعض مخصوص اصناف کا ذکر کرتے ہوئے جکری (ذکری)، حقیقت، سی حرفی اور نقش کے ساتھ سیپارا کا ذکر بھی کیا ہے[۳۲]۔ بلاشبہ ان اصناف میں عارفانہ بیان کی مثالیں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میراں جی شمس العشاقؒ، برہان الدین جانمؒ، میاں مصطفیٰؒ گجراتی اور امین الدین علی اعلیٰؒ کے ہاں مل جاتی ہیں۔ ہم نے ان اصناف کو سماجی نظموں کے زمرے میں رکھا ہے۔ حاجی محمد نوشہ قادریؒ (۱۵۵۲ء اگست ۱۵۵۲ء تا ۲ جنوری ۱۶۵۴ء) نے اپنے عارفانہ کلام کے لیے بارہ ماہا، سوہیے، ناد، چھپے اور رات وغیرہ پنجابی اصناف بھی برتی ہیں۔

جکری (ذکری)، حقیقت، سی حرفی

جکری سے متعلق حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

"اصل میں ذکر یا ذکری تھا۔ ہندوستانی اثرات میں جکری بن گیا[۳۳]۔ چشتیہ سلسلے میں اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً ذکر جلی، ذکر خفی اور ذکر قلبی وغیرہ۔

ڈاکٹر گیان چند نے اسے سماع وغنا کے سلسلے کی چیز قرار دیا ہے۔ جکری کے موضوعات ذکرِ رسول اکرمؐ، ذکرِ پیر کے سلسلہ کا شجرہ، تجرباتِ باطنی و وارداتِ روحانی ہیں۔ شاہ محمد علی جیو گام دھنیؒ نے اس صنف کو جکری کی بجائے "مکاشفہ" کہا ہے۔[۳۴]

صوفیائے کرام میں شیخ بہاؤالدین باجنؒ کو اس صنف میں اولیت حاصل ہے۔ آپ کے ہاں ابتدائی اشعار کو جو ہم قافیہ ہوتے ہیں "حقہ" کہا گیا ہے۔ بعد میں تین یا چار مصرعوں کے جو بند آتے ہیں انہیں "بین" کا نام دیا گیا ہے۔ آخری بند عموماً تین مصرعوں کا ہوتا ہے اور جس میں تخلص برتا جاتا ہے، اس کے پہلے دو مصرعے ہم قافیہ اور تیسرا بغیر قافیہ لیکن ہم وزن ہوتا ہے۔ یہ صنف عام طور پر گجراتی گیتوں کی راگ راگنیوں میں لکھی گئی۔

شاہ محمد علی جیو گام دھنیؒ نے جکری کے بندوں کو "نکتہ" کا نام دیا۔ جن کے بالترتیب یہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں:

صنف کا نام: "مکاشفہ"، نکتۂ اوّل در عقیدہ، نکتۂ دوم، نکتۂ سوم، نکتۂ چہارم در تخلص۔

شاہ محمد علی جیو گام دھنیؒ گجرات کے روحانی سلسلے کے پیشوا تھے۔ جب آپ نے اس صنف کو گجرات میں فروغ دیا تو شاہ باجنؒ اور قاضی محمود دریائیؒ نے بھی اس صنف کو برتا۔

شیخ باجنؒ گجراتی کی جکری سے نمونہ ملاحظہ ہو؛

عقیدہ :- کیوں نہ لاؤں چندرنا، اب ماہ جریالا ینا

بین :- شہ جولایا چندنا بھوبا چولہ ہوکے

بوئی جو آئی نوشہ کی میرا جیوڑا ہوکے

صنف "حقیقت" کا تعلق عارفانہ گیتوں سے ہے۔ اس صنف میں ذکر قلبی کے ذریعے حقیقت پالینے کی جستجو کی جاتی ہے۔ برہان الدین جانمؒ اور امین الدین علی اعلیٰؒ نے راگ راگنیوں کی تخصیص کر دی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں ؛

" میری نظر سے ان کے جو حقیقت کے گیت گزرے ہیں، ان سب کے بندوں کو "بین" لکھا ہے۔ چونکہ ان میں کوئی بعینہٖ موضوع نہیں اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ جکری کا بین ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جکری کا بین دراصل "بین" ہو جس کے معنی "درمیان" ہوں۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ حقیقت جکری ہی کی ایک شکل ہے۔"[۴۵]

" سی حرفی" پنجابی صنف ہے جو مختلف بیتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ بیتوں کے لیے کوئی تعداد مقرر نہیں۔ اس صنف میں ہر بیت کی ابتدا (حروفِ تہجی کے اعتبار سے) کسی نہ کسی حرف سے ہوتی ہے۔ یہ حرف اپنی پوری آواز کے ساتھ جزوِ شعر بنتا ہے۔

اردو میں ہائے مخلوط والے حروف ا ور ڑ کو چھوڑ کر کل ۳۴ حروف بنتے ہیں۔ اس لیے طویل سے طویل سی حرفی ۳۴ بیتوں یا بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ سی حرفی میں عام طور پر ملتانی سیلابی یا پنجابی لوک گیتوں اور ہندی لوک گیتوں کے اوزان برتے جاتے ہیں۔

سی حرفی کے اردو صوفی شعراء میں شاہ علی جیو گام دھنیؒ گجراتی، شاہ برہان الدین جانمؒ، شاہ امین الدین علی اعلیٰؒ، معظم بیجاپوریؒ، شیخ محمود خوش دہانؒ اور شاہ کریمؒ کے نام بہت نمایاں ہیں۔ شاہ برہان الدین جانمؒ بیجاپوری کی سی حرفی سے نمونہ ملاحظہ ہو :

الف ۔ ایمان اللہ پروال سب جگ نہ پایا
اپنی قدرت پہ بھانت رچایا آپیں آپ چھپایا

ب ۔ بہروپ ان ایسا کیتا باقی اپنا کھیل
بازی کھیلے آپ کھلاوے بہودہ پچا میل

شواہد بتلاتے ہیں کہ امیر خسروؒ نے اس صنف میں طبع آزمائی ضرور کی ہوگی گو آج ان کی کوئی ایک سی حرفی بھی محفوظ نہیں۔

مذہبی و دیگر نظمیں

صوفی شعرائے دکن، پنجاب اور سندھ کے متعدد سماجی موضوعات سے متعلق عورتوں اور بچوں کے لیے معراج نامہ، نور نامہ، شاہنامہ، میلاد نامہ اور شمائل نامہ وغیرہ نظمیں لکھیں تاکہ معرفت اور اخلاق کا درس دیا جاسکے۔ موضوع کی مناسبت سے حمد، مناجات، نعت اور منقبت وغیرہ اصناف کو بھی اس ذیل میں دکھا جاسکتا ہے۔

ان اصناف کے علاوہ پہیلی، مکرنی، دوہا، کہہ مکرنی اور قصہ کو بھی معرفت کے بیان کے لیے برتا گیا۔

پہیلی

اس صنف کو "بحر الفصاحت" میں "چیستان" اور "لغز" (بضم لام و فتحہ غین) بھی کہا گیا ہے۔ اس صنف میں (جو نثر اور نظم دونوں میں ہو سکتی ہے) اُلجھے ہوئے بیان کے ذریعے شئے مقصود کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ یوں پہیلی اور معمے میں زیادہ فرق نہیں۔ منظوم پہیلیاں بالعموم لوک گیتوں کے اوزان میں ملتی ہیں۔ شاہ ابوالحسنؒ کی مثنوی "مسک انجن" میں کئی پہیلیاں ملتی ہیں جب کہ امیر خسروؒ نے اس صنف میں شہرت پائی۔

خسروؒ کی ایک پہیلی ملاحظہ ہو:

دس ناری ایک ہی نر
بستی باہر وا کا گھر
بیٹھ سخت اور پیٹ نرم
منہ میٹھا تاثیر گرم (خربوزہ)

مکرنی و کہہ مکرنی

یہ صنف پہیلی سے ملتی جلتی ہے۔ یہ چار مصرعوں (یعنی دو اشعار) کی چیز ہے۔ تین مصرعوں میں ایسا التباس پیدا کیا جاتا ہے جیسے ساجن (شوہر، مرد محبوب) کا ذکر ہو۔ آخری یعنی چوتھے مصرع میں اس التباس کو دور کر کے کسی اور ہی شے کا انکشاف کیا جاتا ہے۔[26]

محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں امیر خسروؒ کے ذیل میں اس صنف کا ذکر کیا ہے، لیکن گیان چند جین ان مکرنیوں کی صاف زبان کے پیشِ نظر انہیں امیر خسروؒ کی تخلیقات نہیں مانتے۔

آزاد نے جس صنف کو "مکرنی" کہا ہے شان الحق حقی نے اسے "کہہ مکرنی" کا نام دیا ہے۔ مثال کے طور پر امیر خسروؒ سے منسوب ایک مکرنی ملاحظہ ہو:

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن، نا سکھی دیا

قصہ

صوفیا کے ہاں قصہ کی صنف مثنوی کے انداز میں عشقیہ قصے باندھنے کی رہی ہے، جس میں روحانی (ظاہری و باطنی سفر) اور دینی معاملات کا بیان ملتا ہے۔ میراں جی شمس العشاقؒ کا "خوش نامہ" اس کی خوبصورت مثال ہے۔

صوفیا کے اس قدیم دور میں جو الفاظ عام طور پہ برتے گئے، ان میں سے چند اجنبی اور نامانوس الفاظ مع مترادفات حالِ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ یوں لفظی سطح پر اُن کی قدامت کا اندازہ لگانا آسان ہوگا نیز اُردو زبان کے ابتدائی نقوش دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گے۔

لفظ قدیم	لفظ حال	لفظ قدیم	لفظ حال
اُونی	اسی	ووہی	وہی
پیلانا	پلانا	کوں	کو
الادعا	علیحدہ	تے	سے
دستے	دکھلاتے	ہور	اور
بوجنا	بوجھنا ۔ سمجھنا	اپسکوں	اپنے کو
لگ	تک	پیلا	پہلا ۔ اوّلین
آنک	آنکھ	سوں	سے
آنا	لانا	دیکھنا سو	دیکھنا
انگے	آگے	نک	ناک
دُسرا	دُوسرا	اندھارا	اندھیرا
بدبُوئی	بدبُو	نیں	نہیں
جاگا	جگہ	اسے	یہ
کیسے	کیا	تیوں	تو
اچھنا	ہوتا	نکو (ناکو)	نہیں ۔ نہ
اُستے بھی	وہ بھی	باج	بغیر
معریفت	معرفت	عناصراں	عناصر ۔ عنصر
دسنا	دکھائی دینا	بیٹ	بیٹھ
سگن	تشبیہ	پھنک	مُعلق
کاٹا	ملاہوا	رہت	مرضی ۔ رضا
نرگُن	پاک	ستی	سے
بارا	ہوا	بوجھے سولوگا	ماہرین ۔ علماء ۔ جاننے والے
ماٹی	مٹی ۔ خاک	منا	منع

بھوت کھینچ	بہت کھینچ	ہمنا	ہمارا

رچرڈ میکسویل ایٹن کے مطابق گجرات اور دکن میں صوفیا کرام نے جس زبان (ہندوی یا دکنی) کو برتا وہ عام طور پہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے مضافات میں دکن اور گجرات کے نو مسلموں اور ہندوؤں کی پھیلی ہوئی آبادیوں کی زبان تھی۔ اس زبان کی تشکیل میں پنجابی کی اس لفظیات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جو ۱۴ ویں صدی میں پنجاب کے مہاجرین کے ساتھ دکن کی طرف چلی آئی۔ یہ زبان اس زمانے میں تلگو زبان کی معرفت سنسکرت کا اثر اور مہاجر صوفیا کے ذریعہ عربی اور فارسی کے اثرات قبول کر رہی تھی۔

ماہر لسانیات ایس کے چیٹرجی نے اپنی کتاب میں برہان الدین جانمؒ اور جگت گیرو کی برتی ہوئی زبانوں کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دونوں حضرات میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک زبان "فارسی عربی سکرپٹ" میں ہے اور دوسرے کی زبان "ہندو ہندی" برہان الدین جانمؒ کے حوالے سے ہندوی (اردو) زبان پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"Shah Burhan's language has some distinct panjabi affinities, and it is noteworthy that he calls it (Guj(a)ri,as contrasted with bhaka= Bhakba,i.c., any Western Hindi vernacular, including Braj Bhakha. This name Gujri gives an indication of the origin and affinity of this dialect. Evidently the Gujars of the Panjab who have given their name to Gujrat and Gujranwala,towns in the Panjab... had come in good numbers with the North Indian armies, and they maintained their name and their dialect in the Deccan for some tune ... This Gujri speech of Shah Burhan is not Gujarati at all; it is a form of the a dialect group of Western Hindi and Panjabi, and is a Panjab dialect to start with ... The Deccan Urdu of Hindi literary tradition thus started in the fifteenth century with what may be called

a sister form of Hindusthani; and this tradition continued to have quite a flourishing life, until it merged into that of Northern Hindusthani or Urdu, after paving the way for the latter."

دکن میں ہندوی / دکھنی (اردو) ایک رابطے کی زبان کے طور پر تو ابھر ہی رہی تھی لیکن میراں جی شمس العشاق ؒ نے جن وجوہات کی بنا پر اس زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رچرڈ میکسویل ایٹن لکھتے ہیں۔

"There were several reasons that the descendants of Shah Miranji Sham al-Ushaq used Dakhni as a literary medium. First, as the vernacular language of Deccani Muslims, it was their mother tongue. The same feeling of cultural distinctiveness that had led the earliest Deccani migrants to revolt against the North and establish the independent Bahmani Kingdom seems to have had its literary counterpart in the appearance of Dakhani compositions. Second, some Chishtis of Bijapur were strongly motivated to preach and teach, and Dakhni was evidently the only vernacular of Bijapur with which both Muslims and Hindus-atleast ;those integrated with the city-were familiar. As the language of the army and the bazaar, Dakhani could reach more people than could the elitist Persian language. Of course, the use of Marathi or Kannada would have reached many more than even Dakhni. But Dakhni had the advantage of being written in the Perso-Arabic script, which would permit,

when necessary, the easy importation of Islamic vocabulary."

مجموعی طور پر نثر اور نظم کی ان جملہ کوششوں کا واحد مقصد عام مسلمانوں اور نو مسلموں کو دین و معرفت کی بنیادی تعلیمات دینا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب میں سادگی اور قلبی واردات کے بیان میں تاثیر ہے۔ یوں ادبیت کی حیثیت ثانوی ہی ہے لیکن اگر بنظرِ غائر اس صوفیانہ جتن کا جائزہ لیا جائے تو برصغیر کی تہذیبی، لسانی اور ادبی فضا کی نئی تشکیل میں صوفی ازم کی عطا نظروں سے چھپی نہیں رہتی۔

بول چال کی زبان ہی کے معاملے میں صوفیا نے ہندوی (اردو) کو تہذیبی سطح پر ایک نیا تناظر فراہم کر دیا اور یوں یہ گری پڑی زبان اس قابل ہو گئی کہ ہندوستان میں نو وارد مسلمانوں کی مختلف زبانوں اور ان کے علاقائی ادب کے موضوعاتی تجربات کے مؤثر اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ عربی، عجمی اور ہندی کے ملے جلے ادبی منظرنامے کو سمیٹ سکے۔ اس طرح اردو زبان و ادب کی نشو و نما کے ابتدائی چند برسوں میں ہی ایک سیکولر لسانی مزاج کا تعین ممکن ہو سکا جو سنسکرت کے کٹر پن کی نسبت ہمہ گیر کشش کا حامل تھا۔

کہاں وہ وقت کہ سنسکرت "الٰہی زبان" سمجھی جاتی تھی اور پراکرت (ہندوی بھی اسی شمار میں آتی تھی) مجبور محض انسانوں کی زبان۔ عامی پراکرت بولتے تھے اور خواص سنسکرت۔

سنسکرت، مذہبی، علمی اور ادبی مباحث کا وسیلہ تھی جب کہ ہندوی (اردو) محض عوام کے لین دین کی زبان۔ کہا جا سکتا ہے کہ صوفی ازم نے برصغیر کی کچلی ہوئی محکوم آبادیوں کو سماجی سطح پر لسانی ناانصافی سے نجات دلائی نیز ہندوی ریختی زبان کو دین اور دنیاوی علوم کے لیے برت کر وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کیا۔ بعینہٖ اردو صوفیا نے "وحدۃ الوجود" کے فلسفے کو موضوعی سطح پر خصوصی التزام کے ساتھ ہندوی نظم و نثر میں برت کر نہ صرف مشرکانہ عقیدے پر ضربِ کاری لگائی بلکہ "پاک اور پوتر" برہمن اور "ملیچھ" شودر کی اونچ نیچ کو بھی ختم کر دیا۔ اس زمانے کی عوامی بولیوں (بھاکا "یا گجری") میں شاعری، برہمنوں کے مذہبی، سماجی اور سیاسی نظام کے تصورات کی حدود تک محدود تھی جب کہ صوفیا کرام نے اسے لامحدود کر دیا۔ اسی طرح ہر صنف اور ہر اظہاری سانچے کے لیے ایک ہی پیرایۂ اظہار اختیار نہیں کیا گیا۔ دوہا، خیال اور راگوں کا بنیادی تعلق ہندی شاعری اور موسیقی سے ہے اس لیے لفظیات کے برتاؤ اور رموز و علائم کے معانی میں نئی اختراعات کے ساتھ

ہندی بھاکا (بھاشا) اور اس کے اسالیب کو اختیار کیا گیا اور یوں ہندی زبان وادب پر موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے نئے جہانوں کے در باز ہوئے۔

ہے ہوری گیان پچھاری
نہ دیکھیں بھاکا گنبھیری

(برہان الدین جانم)

خصوصی طور پر ایسے میں ہندی شاعری کے ڈانڈے موسیقی کے ساتھ جوڑ دینے کی شعوری کوشش اس لیے کی گئی کہ موسیقی کا عمل دخل ہندوستانی مذاہب کی سماجیات میں بہت تھا۔ یوں اظہار کے دونوں وسیلوں (شاعری اور موسیقی) کو نہ صرف مکمل طور پر برتا گیا بلکہ شعر و موسیقی کے ہر دو میدانوں میں نئی اختراعات بھی سامنے آئیں۔ فارسی شعر کی ہندی راگوں میں ادائیگی کو "ریختہ" کا نام دیا گیا۔[۴۹] آگے چل کر اردو کے بدلتے ہوئے ناموں میں "ہندی" یا "ہندوی" کے بعد "ریختہ" نام کے طور پر اردو زبان کے لیے مخصوص ہو گیا اور بعد ازاں ہندی اور فارسی کے باہمی امتزاج سے متشکل ہونے والی شاعری کے لیے یہی نام مناسب خیال کیا گیا۔

رسم الخط کے معاملے میں صوفیانہ سیکولرازم کا اظہار یوں ہوا کہ برصغیر کی گری پڑی زبانیں عربی رسم الخط اختیار کرتی گئیں اور دکنی/ہندی (اردو) کی صورت میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر ہندوستان بھر کی علاقائی حدود میں جکڑی ہوئی چھوٹی بڑی زبانیں ہم آہنگ ہوتی چلی گئیں۔ یوں دکنی/ہندی (اردو) ایک بین الصوبائی رابطے کی زبان کی حیثیت میں اُبھری جب کہ عربی اور فارسی ادبیات کے عظیم خزینہ سے اس کا معنوی اور صوری الحاق سٹرکچرل سطح پر اسلوبیاتی تجربات کے لیے زمین ہموار کر گیا۔

عام طور پر صوفیا نے عام فہم زبان برتی اور بات چیت کا انداز اختیار کیا۔ اس سے ہوا یہ کہ ہندی (اردو) زبان میں مکالمہ نگاری کو ورثا دے کی تجرباتی سطح پر مضبوط بنیادیں میسر آ گئیں اور بعد ازاں یہیں سے ڈرامہ اور مثنوی سے ناول تک کا سفر کٹھن نہیں رہا۔ اسی طرح صوفیانہ نثری اور منظوم رسائل نیز مثنویوں اور نظم کی دیگر اصناف میں فارسی کی شناس کے ساتھ اس کا ادبی تجربہ اور عرب کی زبان دانی کے ساتھ مقولوں کی صورت میں لوک دانش کا خزانہ ہندی (اردو) میں منتقل ہوا، اور یوں اس گری پڑی زبان کو بہت کم مدت میں "اردوئے معلّیٰ" کے درجہ تک اوپر اٹھ آنے میں سہولت پیش آئی۔

قدیم دکنی ادب کا اوّلین شاہکار "سب رس" ہی کو قرار دیا جاتا رہا ہے، جب کہ "سب رس" کی اہمیت اسلوب کی بنا پر ہے،

"ہمت نظر کو بہوت کیا، پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسیا، کہا شاباش تجھے اس کام پہ بہوت ہم سے۔"

("سب رس" سے اقتباس)

مُلا وجہی کے اس نثری اسلوب کی دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ خوبی واضح طور پر نظر آتی ہے کہ اس میں وجہی نے نثر اور نظم کو باہم ایک کر دیا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ نظم کی ساری خوبیاں نثر میں سمو دی ہیں۔ لیکن اس بڑے کارنامے کی بنیاد صوفیا کرام کی وہ نثری تحریریں ہی بنی ہیں جن میں پند و نصائح کے بیان کے لیے نظم اور نثر کو گھُلا ملا کر نئے اسالیبِ بیان کی جستجو کی گئی ہے، جب کہ جدید دور تک میں بائبل کے اردو تراجم میں بھی بول چال کی زبان ہی برتی گئی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ درباری سرپرستی میں ہی ملا وجہی وہ کارنامہ سرانجام دے گئے، جس کا تتبع بھی ایک زمانے تک ممکن نہ ہو سکا۔

ہم اپنے نثری ادب کے اسلوبیاتی پس منظر پہ نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت کھُلتی ہے کہ عربی اور فارسی کی نثری اور منظوم کتب کے ہندوی میں تراجم اور شرحیں، نیز صوفیانہ رسائل نظم و نثر میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کے تراجم و تشریحات، ایک ایسا عظیم دینی اور لسانی (ایک حد تک ادبی) کارنامہ ہے، جس نے ہندوی زبان کو اُس کے ایامِ طفلی میں ہی اسلوبیاتی سطح پر اظہار کے ایسے سانچے فراہم کر دیے جن سے جانکاری کے لیے عالمی سطح پر بیشتر زبانوں کو صدیوں کے تجربات سے گزرنا پڑا ہے۔

موضوعی اعتبار سے بھی ہندوی زبان و ادب نے ایک نئی کروٹ لی۔ اشرف بیابانیؒ کی مثنوی "نوسرہار" کا موضوع واقعۂ کربلا ہے۔ اشرف بیابانیؒ کی اپروچ فلسفیانہ ہے، اور اُن کے Thesis کے مطابق سانحۂ کربلا، بیعتِ یزید سے نہیں بلکہ ناکامیٔ عشق کی بنا پہ پیش آیا۔ اس اعتبار سے یہ مثنوی، مرثیہ کے عام موضوع سے ہٹ کر تخلیق کی گئی ہے۔ اس مرثیہ نما "فلسفیانہ مثنوی" سے ایک شعر ملاحظہ کرتے چلیے:

ہمنا بھی اب وو ہی بات
سب کوں جانا آوسی گھاٹ

اشرف بیابانیؒ کی مثنوی "لازم المبتدی" میں دس عنوانات قائم کر کے خالصتاً دینی مسائل کے تعلق سے پیش کیے گئے ہیں۔ "نوسرہار" میں اشرف بیابانی کی فلسفیانہ رسائی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مثنوی

لازمی المبتدی" محض اپنے عنوان کی وجہ سے نہیں، موضوعی اعتبار سے بھی اور اپنی ہیئت کی سطح پر بھی مبتدیوں (نو مسلموں) کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کے ساتھ اگر شاہ ابوالحسن کی مثنوی "سک انجن" کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو "سک انجن" میں شاہ صاحب کا treatment بالکل مختلف ہے جب کہ دونوں مثنویوں میں مبتدیوں سے ہی خطاب ہے۔

"سک انجن" میں دکن کے مقبول کھیل "آنکھ مچانی" (آنکھ مچولی) کا طریقہ کار برتا گیا ہے، نیز مثنوی میں شامل حکایتیں اور پہیلیاں (لوک دانش) شامل کر کے تصوف کے رموز کو کھیل ہی کھیل میں سمجھانے کا جتن کیا گیا ہے۔

یہ متنوع موضوعات کے ساتھ مطابقت رکھنے والے طریقہ کار کا تنوع ہی ہے کہ برہان الدین جانم کی مثنویاں سادہ ہیں لیکن بقول ڈاکٹر عبدالحق "بعض مقامات پر شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے"۔[۵]

عام طور پر صوفیانہ منظوم تخلیقات کو ہندوستان کے لوک ادب سے متعارف خیال کیا جاتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صوفیا کرام کی سینکڑوں منظوم تخلیقات ایک زمانے سے دکن، گجرات، پنجاب، ملتان اور سندھ کی دیہی آبادیوں میں خواتین کی لوریاں اور غمی و شادی کے گیتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر "چکی نامہ" اور "چرخہ نامہ" چکی پیستی اور چرخہ کاتتی ہوئی عورت گنگناتی آئی ہے۔ اسی طرح "شادی نامہ" بیاہ شادی کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ "سہاگن نامہ" اور "سہیلا" بیاہتا عورتوں کے گیت ہیں۔

ان شعری اصناف میں برتی گئی امیجری اور پاکیزہ خیالات بھی مقبولیت کا باعث بنے جب کہ مراٹھی اور ہندوستانی کی دیگر بولیوں کے قدیم ادب میں یہ تمام اصناف پہلے سے موجود تھیں لیکن مقبولیت کے اس درجے کو نہ چھو سکیں۔

جہاں تک صوفیا کی شعری تخلیقات میں بحور کے ظاہری جھول اور املا کا معاملہ ہے، اس کا مطالعہ لسانیات کے طالب العلم کی حیثیت سے کرنا پڑے گا، خصوصی طور پر اس زمانے کے ہندوی الفاظ کے تلفظ پر بھی توجہ دینا پڑے گی اور یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ پیش نظر تخلیقات کے خالق صوفی مبلغ تھے، شاعر یا ادیب نہیں، اور نہ ہی اس کا انہیں دعویٰ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "تسبیح" کو "تسبی" اور "صحیح" کو "صحی" باندھا ہے لیکن یہ سلسلہ میر تقی میر کے زمانے تک چلا آیا ہے۔ قافیے کے دروبست میں صرف صوت کا خیال رکھا گیا ہے اور صوتی سطح پر بھی آوازوں کے آہنگ میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً "نمک" کا قافیہ "خالق" باندھا

اور برتا گیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ ہندی میں "ک" اور ق کی آواز میں فرق نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح عربی بحور کے نظام میں ہندی بحروں کا استعمال عجیب و غریب صورتیں سامنے لاتا ہے اور شعر میں جھول کا باعث بنتا ہے۔ لیکن لفظی تلفظ کی غلط بندش اور دیگر خامیوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس وقت کے ہندوستانی شعرا اور اہلِ علم ہندوی (اردو) جیسی گری پڑی زبان کے وتادوے سے اپنی شعری اور علمی تخلیقات کو آلودہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سو لفظ کے صحیح استعمال اور بُنت کے کمال کی سند کہاں سے ملتی؟

صوفیا کرام کی ان ابتدائی کوششوں میں ادبیت کی حیثیت ثانوی سہی، لیکن انہوں نے برصغیر کے تہذیبی، لسانی اور ادبی مزاج کو ایک نئی کروٹ ضرور دے دی۔

یہ عطا ہے اُن کے باغیانہ لحن کی اور اُس نظر کی جو ظاہر اور باطن دونوں پر یکساں ہے۔

حوالہ جات و حواشی :

لہ "کشف المحجوب" مطبوعہ : مدنی کتب خانہ، چوک گنپت روڈ، لاہور ۔ س ن

۲ہ مطبوعہ : امریکہ، ص ا

۳ہ مشرقی کتب کے علاوہ دیکھیے :

۱۔ 'Sufism' از اے ۔ جے آربری، ص ۱۱ تا ۱۴

۲۔ 'Hindu and Muslim Mysticism' از آر۔ سی زیہنر

مطبوعہ : ایتھلون پریس، لندن ۔ ۱۹۶۰ء

۳۔ 'Sufi orders' از جے۔ ایس ٹرمنگھم، ص ا

۴ہ مولویہ درویش نہ مجذوب تھے نہ گداگر، البتہ ہمہ وقت تحصیل علوم میں مشغول رہتے تھے۔

۵ہ دراصل مولویہ درویش ہر نئے سلطان کی کمر سے حضرت عمرؓ کی تلوار باندھا کرتے تھے۔ یہ ایک قسم کی رسم تاجپوشی تھی جو مزار حضرت ابوایوب انصاریؓ پر ادا کی جاتی تھی۔ یہ عمل اختلاف کی جڑ تھا۔

۶ہ کچھ یہی سبب ہے کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے جنازے میں سینکڑوں عیسائی بھی شریک تھے۔

۷ہ جب سلجوقی حکومت کا خاتمہ چنگیزیوں کے ہاتھوں ہوا تو عثمانی اپنے تازہ دم اسلام کے ساتھ اناطالیہ میں وارد ہوئے۔ یہ نئی طاقت اور قوت امام غزالیؒ (متوفی ۱۱۱۱ء) کی کوششوں کا نتیجہ تھی جو صوفی طریقت اور شریعت کے درمیان تطابق کے لیے کی گئی تھیں۔

۸ہ بحوالہ "اردو شہ پارے" جلد اوّل مرتبہ : سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء

۹ہ عبداللہ حسینیؒ کے ترجمہ "نشاط العاشقین" کا مخطوطہ زوال سرنگاپٹم سے پہلے ٹیپو سلطان کی ذاتی لائبریری میں محفوظ تھا۔

۱۰ہ اردو اکیڈمی، حیدرآباد دکن ۱۹۶۶ء

۱۱ بحوالہ: "اُردو شہ پارے" از محی الدین قادری زور، ڈاکٹر - اس ترجمے کا ایک مخطوطہ ۱۷۰۶ء میں آغا حیدر صاحب کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ تھا - اس مخطوطے کے کُل ایک سو اٹھاسی ورق اور ہر ورق میں پچیس سطریں تھیں۔

۱۲ یاد رہے کہ یہ کتاب ۱۹۴۵ء سے قبل ترجمہ ہوئی۔ اس کتاب کی فہرست ابواب یُوں ہے: پہلے باب میں توبہ، دوسرا باب طریقت کا پہچانت کرنا نفس، دل، روح، سرِ ذات شریعت، حقیقت، معرفت اوپر، تیسرا باب وضو کا، چوتھا باب دینا، ترکِ دُنیا، پانچواں باب تجرید ہور تفرید - چھٹا باب اپنی پہچانت سوں نورِ محمد کا اس پہچانت میں - ساتواں باب عشق کا - آٹھواں باب معشوق - نواں باب فنا ہور بقا ہونے کا، دسواں باب سفر کا۔

۱۳ دیکھیے "The Dakani incription on the amin bargah in Bijapur" از پروفیسر ایم۔ اکبرالدین صدیقی مشمولہ EPIGRAPHIA INDICA ARABIC + PERSIAN SUPPLEMENT سلسلہ ۱۹۶۸ء، ص ۷۹ تا ۸۱

۱۴ "اُردو شہ پارے" میں زور صاحب نے اس کتاب کا نام "کلمات الحق" لکھا ہے، جو درست نہیں - یہ کتاب ۱۵۸۲ء سے قبل تصنیف ہوئی۔

۱۵ SUFIS OF BIJAPUR (۱۳۰۰-۱۷۰۰ء) مطبوعہ امریکہ

۱۶ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا یہ رسالہ انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد دکن نے ڈاکٹر عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۴-۲۵ء میں شائع کیا تھا - یہ مختصر رسالہ ۱۸×۲۲ کی تقطیع پر ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے - اب اس کتاب کی کئی طباعتیں مل جاتی ہیں جن میں سے خلیق انجم کی مرتب کردہ "معراج العاشقین" اہم ہے۔

۱۷ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوریؒ (متوفی ۱۴۹۶ء) کی یہ کتاب قبل ۱۴۹۳ء کی تصنیف ہے۔

۱۸ شاہ برہان الدین جانمؒ خلعت میراں جی شمس العشاق بیجاپوریؒ متوفی ۱۵۹۷ء کی یہ کتاب لگ بھگ ۱۵۹۴ء کی تصنیف ہے۔

۱۹ ملا وجہی قطب شاہی دربار سے وابستہ رہے تھے - انہوں نے اپنے مربی عبداللہ قطب شاہ کے

پہلے اسے دکھنی (اردو) میں رقم کیا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اس نایاب کتاب کو مع مقدمہ و فرہنگ۔ انجمن ترقی اردو ہند سے ۱۹۳۲ء میں شائع کروایا۔

۱۰؎ دیکھیے: مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اوّل، ص ۲۱۰

۱۱؎ روہڑی (سندھ) کے بے بدل فارسی شاعر جنہوں نے مرزا غالب کو بھی متاثر کیا۔

۱۲؎ نصیرالدین ہاشمی کے مطابق ملا وجہی نے غالباً حضرت وجیہ الدین گجراتی کے رسالے کو بنیاد بنایا۔ دیکھیے: دکن میں اردو مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۳ء۔

۱۳؎ دیکھیے: اردو نظم اور اس کی اصناف، از گیان چند جین مطبوعہ "شب خون" الہ آباد، شمارہ جولائی، اگست ستمبر ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵۔

۱۴؎ بھگتی تحریک کے مسلم شاعر۔ اصل نام کبیر احمد۔

۱۵؎ اس پہلو پر بھی بھکاری داس، ڈاکٹر بھولا شنکر ویاس، عرفنی بھاٹو، ڈاکٹر چندر بھان اور ڈاکٹر گیان چند جین متفق ہیں۔

۱۶؎ صوفی شعرا کے علاوہ گیت نگاروں سے متعلق تفصیلات کے لئے دیکھیے: "اردو گیت"، از ڈاکٹر قیصر جہاں مطبوعہ دہلی مارچ ۱۹۷۷ء۔

۱۷؎ "درسِ بلاغت" میں شمیم احمد نے بحر کے مشترک ہونے پر اعتراض کیا ہے۔ دیکھیے ص ۱۵۳۔

۱۸؎ خواجہ عبدالمجید (مرتب، "جامع اللغات") کے مطابق امیر خسروؒ کا زمانہ ۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء تک کا ہے جب کہ رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں آپ کی تاریخ ۶۰۵ھ مطابق ۱۲۰۸ء یا ۱۲۰۹ء رقم کی ہے۔ حضرت امیر خسروؒ سے متعلق تاحال سب سے مستند کتاب "امیر خسرو" بزبان انگریزی ہے۔

۱۹؎ "شکارنامہ" (میر تقی میر) اور "گلزار نسیم" (پنڈت دیا شنکر نسیم) میں غزلیں شامل کی گئیں۔ "خواب و خیال" (نواب مرزا شوق) میں غزلیں، ترجیع بند اور قطعات شامل ہیں جب کہ "نگارستانِ الفت" (رجب علی) میں دوہے شامل کیے گئے۔

۲۰؎ دیکھیے: اردو مرثیے کا ارتقا، بیجاپور اور گولکنڈہ میں، از ڈاکٹر چراغ علی۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۷۳ء۔ ص ۱۹۷ تا ۱۹۸۔

۴۱ دیکھیے، عروض وقافیہ، از کنہیا لال ماتھر مطبوعہ، آگرہ

۴۲ مملوکہ: سالار جنگ میوزیم حیدرآباد (دکن) اردو سیکشن Mss "تصوف واخلاق" نمبر ۳۶۔

۴۳ مملوکہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد (دکن) نمبر ۹۳ B ، ۱۲۸۹ — b ۱۲۹

۴۴ مملوکہ: ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد (دکن) نمبر b ۲ —— b ۱

۴۵ دیکھیے دیباچہ "سکھ انجن" از ڈاکٹر سعیدہ جعفر مطبوعہ حیدرآباد، دکن ص ۶۲

۴۶ مملوکہ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد (دکن) اردو سیکشن Mss پندونصائح نمبر ۳

۴۷ مملوکہ: ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد (دکن) اردو سیکشن Mss تصوف واخلاق نمبر ۲۵

۴۸ مملوکہ، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد (دکن) اردو سیکشن نمبر B ۱۲۰

۴۹ دیکھیے: شاہ امین الدین علی اعلیٰؒ — حیات اور کارنامے، از ڈاکٹر حسینی شاہد مطبوعہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۷۳ء — ص ۳۱۱ تا ۳۱۶

۵۰ مملوکہ: سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد (دکن) اردو سیکشن Mss پندونصائح نمبر ۱۴۳، ۵۸ —— ۱۸

۵۱ مملوکہ، درگاہ شاہ امین الدین علی اعلیٰؒ، بیجاپور (دکن) - وہیں سے ایک قلمی نسخہ مکمل حالت میں ہے - قیاس غالب ہے کہ دونوں نسخے شاہ علی پیر حسینیؒ کے مریدوں نے نقل کیے۔

۵۲ دیکھیے: اردو نظم اور اس کی اصناف، از گیان چند جین مطبوعہ: شب خون الہ آباد، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۰

۵۳ دیکھیے: آٹھویں اور دسویں ہجری کی فارسی تالیف سے اردو زبان کے وجود کا ثبوت مشمولہ: مقالات شیرانی، جلد اول مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء - ص ۴۳

۵۴ بحوالہ "اردو نظم اور اس کی اصناف" از گیان چند جین، مطبوعہ "شب خون" الہ آباد جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۸۵ء - ص ۲۰ -

۵۵ بحوالہ "اردو نظم اور اس کی اصناف" از گیان چند جین، مطبوعہ: شب خون، الہ آباد، جولائی اگست، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۰ -

۴۶ بحوالہ "اُردو نظم اور اس کی اصناف" از گیان چند جین، مطبوعہ "شب خون"، الہ آباد، جولائی اگست، ستمبر ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵

۴۷ دیکھیے 'Sufis of Bijapur' ص ۱۲۸

۴۸ 'Sufis of Bijapur' ص ۱۲۹ تا ۱۳۱

۴۹ تحفۂ چشتیہ (۱۰۶۵ھ) از مخدوم علاؤالدین برنالیؒ کے مطابق امیر خسروؒ کے زمانے تک ریختہ کا لفظ صرف موسیقی کی اصطلاح تھی۔ جس کے معنی تھے "کسی ایک تال اور راگ میں ہندی اور فارسی مصرعوں کی ترتیب" خود امیر خسروؒ سماع کے قائل تھے اور انہوں نے بطور موسیقار بھی جدت پسندی کے ثبوت فراہم کیے۔

۵۰ بحوالہ: اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، از ڈاکٹر عبدالحق۔

مقتدرہ کے پمفلٹ

1۔ اعلیٰ تعلیم میں اردو کی حیثیت
2۔ سائنس اور ریاضی کی درسی کتابیں
3۔ اردو ہندسے اور ریاضی کی علامتیں
4۔ مقتدرہ قومی زبان اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اشتراک عمل
5۔ مقتدرہ قومی زبان اور اردو ٹیلی پرنٹر
6۔ وزارت قانون اور اسلامی نظریاتی کونسل کے اردو تراجم
7۔ اردو کمپیوٹر تیز تر ہے
8۔ مشرقی ممالک میں قومی زبان کے ادارے
9۔ آزاد کشمیر میں نفاذ اردو
10۔ وضع و استناد اصطلاحات
11۔ قومی زبان کا نفاذ، چند دشواریاں
12۔ تربیتی ورکشاپ برائے ادارہ ثقافت پاکستان
13۔ بلوچستان میں نفاذ اردو
14۔ قومی زبان اور علاقائی زبانوں کا رشتہ
15۔ قومی زبان کی پالیسی کے بارے میں چند خیالات
16۔ دفتری زبان اور نصاب تعلیم
17۔ دفتری اردو
18۔ برطانیہ میں اردو کی تعلیم
19۔ ایران میں وضع اصطلاحات کے اصول
20۔ اردو کی وسعت اور جامعیت
21۔ مجلس زبان دفتری پنجاب، ایک تعارف
22۔ مقتدرہ قومی زبان ۔ آئندہ منصوبے
23۔ پاکستان میں نفاذ اردو کی داستان
24۔ ہندسے اور ان کی تاریخ
25۔ قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں
26۔ قومی زبان کے بارے میں چند انٹرویو (حصہ اول)
27۔ مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور علمی مراکز
28۔ قطر میں اردو
29۔ اردو ذریعہ تعلیم اور نفاذ اردو
30۔ قومی زبان اور ہمارا قومی تشخص
31۔ اردو بحیثیت قومی زبان
32۔ اردو ٹائپ کی کہانی
33۔ متحدہ عرب امارات میں اردو
34۔ مقتدرہ کے سیمیناروں کی قراردادیں
35۔ کویت میں اردو
36۔ جاپان میں اردو
37۔ جامعہ کراچی میں اردو
38۔ چترال میں اردو
39۔ اردو گنتی کے چند پہلو
40۔ اردو کتابت کیلئے چند کارآمد اصول
41۔ اردو اور صوفی ازم